اسلامی بینکاری :غلط سوال کا غلط جواب

زاہد صدیق مغل

سود کی آلائشوں سے پاک اسلامی معیشت کی قیام کیلئے فکری بنیاد فراہم کرنا،''المباحث الاسلامیہ'' کے اجراء کے مقاصد میں اول روز سے شامل رہا ہے، اسلامی بینکاری سے متعلق بحث گزشتہ دو(٢) عشروں سے جاری ہے اور اسلامی دنیا میں اس پر پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ المباحث الاسلامیہ سمجھتا ہے کہ ایسی تمام سنجیدہ تحریریں جو اسلامی بینکاری سے متعلق ہوں، قارئین تک پہنچانا ضروری ہے۔
زیرِ نظر تحریر معاصر مجلہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ میں کئی اقساط میں شائع ہوئی تھی، اب ان کے شکریہ کے ساتھ یکجا شائع کیا جارہا ہے۔
مزید برآں حضرت مولانا مفتی محمد زاہد مدظلہ العالی نے ردِّعمل کے طور پر بعنوان ''بلاسود بینکاری ایک تنقیدی جائزہ'' لکھا، وہ بھی شمارے میں موجود ہے۔ قارئین دونوں مضامین ایک ساتھ ملاحظہ فرمائیں۔ (ادارہ)

مروّجہ سودی بینکاری کو 'مسلمان بنانے' کی مہم پچھلی دو دہائیوں سے اپنے عروج پر ہے اور نہ صرف یہ کہ مجوّزین اسلامی بینکاری بلکہ ان کے ناقدین کی ایک اکثریت نے بھی یہ فرض کرلیا ہے کہ اس مہم کے ذریعے نظام بینکاری کو کسی نہ کسی درجے (زیادہ یا کم کے اختلاف کے ساتھ) اسلامی بنا ہی لیا گیا ہے۔ اگر اصولاً یہ مقدمات درست مان لئے جائیں کہ (١) اپنے مقاصد اور طریقہ کار (procedure) دونوں اعتبارات سے بینک کی اسلام کاری ممکن ہے، نیز (٢) اسلامی بینکاری درست سمت میں رواں دواں ہیں تو ان کے منطقی لازمے کے طور پر جو بحث ابھرے گی، وہ اس نظام میں 'مزید اصلاح' کی کوشش کرنے ہی کی ہوگی نہ کہ اس جدوجہد کو لاحاصل قرار دے کر ترک کردینے کی۔ چنانچہ اسلامی بینکاری کی اسلامیت کے ضمن میں مجوّزین و ناقدین کی ایک اکثریت کے درمیان اختلاف کی بنیاد نہیں کہ بینکاری اصولاً اسلامی ہو ہی نہیں سکتی بلکہ یہ رہی ہے کہ 'مروّجہ اسلامی بینکاری کتنی اسلامی ہے۔ مجوّزین کے نزدیک مروّجہ اسلامی بینکاری میں موجود 'اسلامیت کی مقدار' اس نظام کو اسلامی کہنے کیلئے بہت کافی ہے جبکہ ناقدین کے خیال میں مروّجہ نظام میں ابھی تک 'مطلوبہ اسلامیت' پیدا نہیں کی جاسکی۔ گویا ناقدین بھی اس مفروضے کو قبول کرتے ہیں کہ جو کچھ بھی خرابی ہے، وہ مروّجہ 'اسلامی بینکاری میں ہے، لہذا کوئی ایسی 'غیر مروّجہ' اسلامی بینکاری بھی ممکن ہے جو ان خرابیوں سے پاک ہوگی۔ مجوّزین اور ناقدین اسلامی بینکاری کی ایک اکثریت کے درمیان یہ قدر مشترک اسلئے پائی جاتی ہے کہ دونوں گروہ درج بالا مفروضہ مقدمات کو قبول کرتے ہیں۔

اس کے برخلاف ناقدین کا دوسرا گروہ وہ ہے جس کے خیال میں بینکاری اپنے مقاصد اور عمل دونوں لحاظ سے غیر اسلامی شے ہے اور اس کی اسلامیت ناممکن ہے۔ چونکہ اس گروہ اور مجوّزین کے مقدمات ہی میں بنیادی فرق ہے، لہذا ان دونوں کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں اور دونوں کی بحث کا حاصل 'مروّجہ اسلامی بینکاری کی اصلاح' نہیں بلکہ اس جدوجہد کی 'بقا و عدم' کا ہے، یعنی

مجوزین کے نزدیک اس کو جاری رہنا چاہیے جبکہ ناقدین کے خیال میں یہ جدوجہد احیائے اسلام کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہے، لہذا اسے لازماً ترک کرنا ہوگا۔ ناقدین اسلامی بینکاری کے دونوں گروہوں کا مجوزین سے اختلاف کرنے میں نوعیت اختلاف کا فرق درحقیقت اس بنا پر ہے کہ اسلامی بینکاری کا تنقیدی مطالعہ کرتے وقت تین سطحوں پر گفتگو کرنا ممکن ہے:

ا۔ اسلامی وسودی بینکاری کا تطبیقی جائزہ: یعنی یہ سمجھنے کی کوشش کرنا کہ آیا اسلامی بینک اور سودی بینکوں کے مقاصد میں کیسا تعلق ہے، کیا یہ دونوں کسی ایک ہی نظام زندگی (سرمایہ داری) کے مقاصد حاصل کرنے کے دو مختلف وسائل ہیں یا ان کے مقاصد میں کوئی تفریق موجود ہے۔ اس بحث میں اسلامی بینکاری کو جزوی طور پر نہیں بلکہ ایک بڑے نظامہائے زندگی کے ایک پرزے کے طور پر جانچ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آیا اس طریقہ کار سے مقاصد الشریعہ کا حصول ممکن ہے بھی یا نہیں۔ گویا یہاں گفتگو کا محور 'جزو' نہیں بلکہ 'کل' ہوتا ہے؟

۲۔ اسلامی بینکاری کے امکانات کا جائزہ: یعنی یہ تجزیہ کرنا کہ آیا موجودہ نظام بینکاری کو اسلامیانے کا کوئی طریقہ ممکن بھی ہے یا نہیں۔ اس تجزیئے میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ بینکنگ اصلاً کیا ہے؟ کیا واقعی ایک زری ثالث (financial intermediary) ہوتا ہے جیسا کہ مجوزین اسلامی بینکاری کا خیال ہے؟ اگر اس کی حقیقت اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو کیا اسے اسلامی بنانا ممکن ہے؟

۳۔ اسلامی بینکاری کے طریقہ کاروبار کا فقہی جائزہ: اس سطح پر جزواً جزواً یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلامی بینک جو زری سروسز اور پراڈکٹس (Financial products and services) مہیا کر رہے ہیں، وہ قواعد شریعہ کی شرائط پر پورا اترتی ہیں یا نہیں۔ اس تجزیئے میں اسلامی اور مروجہ بینکاری نظام کا اس اعتبار سے تطبیقی موازنہ بھی کیا جاتا ہے کہ آیا واقعی اسلامی بینک موجودہ بینکاری نظام سے علیحدہ کوئی کام کر بھی رہے ہیں یا محض 'نئی بوتل میں پرانی شراب' والا معاملہ ہے۔ گویا یہاں بحث کا مرکزی نکتہ 'جزو' ہوتا ہے۔ ناقدین کی وہ اکثریت جو اپنے مقدمات میں مجوزین کے مماثل ہے، درحقیقت پہلی دونوں سطحوں سے سہو نظر (by pass) کرتے ہوئے اپنی تنقید کی بنیاد اس تیسری سطح پر رکھتی ہے۔ گویا مجوزین اور ناقدین کی اس اکثریت کے درمیان قدر مشترک تنقید کی اول دونوں سطحوں کو نظر انداز کرنا ہے۔

اسلامی بینکاری بطور ایک 'کل' یعنی اس کے مقاصد کے شرعاً باطل ہونے کی بحث پر راقم الحروف نے دو الگ مضامین تحریر کیے ہیں جن کی تفصیلات وہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ (۱) زیر نظر مضمون کا نفس موضوع اسلامی بینکاری پر تنقید کی دوسری سطح پر بحث کرنا ہے، یعنی یہاں ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ آیا اپنے عمل کے اعتبار سے بینک کی اسلام کاری ممکن ہے یا نہیں؟ ہم دیکھیں گے کہ مجوزین (اور ناقدین کی ایک اکثریت) بینکنگ کے جس تصور کو بنیاد بنا کر اس کی اسلام کاری ممکن سمجھتے ہیں (یا اس پر تنقید کرتے ہیں)، درحقیقت وہ تصور بینکنگ ہی سرے سے غلط ہے، گویا ان کی دلائل کی عمارت ہی بے بنیاد ہے۔ مجوزین کے خیال میں بینک محض ایک زری ثالث (financial intermediary) ہے جس کا کام بچتوں اور سرمایہ کاری میں تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں موجودہ بینکنگ کی 'اصل خرابی' یہ ہے کہ اس تعلق کے قیام کے لیے وہ 'سود' کا راستہ اختیار کرتی ہے، لہذا اگر اس کے طریقہ کار کی اصلاح کر کے

اس تعلق کو سود کے بجائے 'شرکت ومضاربت' وغیرہ کے اصولوں پر قائم کر دیا جائے تو بینک کو کلمہ پڑھانا ممکن ہے۔ مگر ہم دیکھیں گے کہ بینکنگ کا یہ تصور درست نہیں اور نہ ہی بینکنگ کو شرکت وغیرہ کے اصولوں پر چلانا ممکن ہے۔ بینکنگ کو درست طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجوزین مسئلے کی اصل حقیقت تک پہنچ نہ سکے اور اس ظاہر بینی کا نقصان یہ ہوا کہ سرمایہ داری کے سب سے بڑے ادارے یعنی بینک کو اسلامی لبادہ اوڑھا دیا گیا۔ چنانچہ اسلامی بینکاری پر تنقید کے درج بالا ڈھانچے کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ مجوزین اسلامی بینکاری دوہری غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں:

☆ ایک طرف جب وہ احیائے اسلام کے لیے 'سودی بینکنگ کا متبادل کیا ہے' کا سوال اٹھا کر اس کا حل پیش کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہیں تو اپنے مقاصد کے اعتبار سے ایک غلط سوال اٹھا کر اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں

(مجوزین کا سوال کیونکر غلط ہے؟ اس کا تعلق تنقید کی اول سطح سے ہے)۔

☆ اور دوسری طرف اس کا متبادل دینے کی کوشش میں بھی وہ پوری تحقیق سے کام لیے بغیر 'بینکنگ کیا ہے' کا ایک غلط جواب دے کر اپنی عمارت قائم کرتے ہیں۔ (گویا ظلمت بعضها فوق بعض)۔ دوسرے لفظوں میں مجوزین کا سوال اور جواب دونوں ہی غلط ہیں۔

مجوزین کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ سرمایہ داری کو فطری انسانی تقاضوں کا ارتقا سمجھتے ہیں اور اسی لیے وہ ہر سرمایہ دارانہ ادارے کی اسلام کاری ممکن سمجھتے ہیں۔ (۲) مجوزین کا عمومی طریقہ کار یہ ہے کہ وہ بینکاری نظام میں جاری لین دین کی 'مخصوص شکلوں' (transactions forms) کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں مگر وہ لین دین جس 'معاشی ماحول اور حالات' میں ہو رہی ہیں، اس سے یکسر سہو نظر کرتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس معاشی ماحول economic environment کا درست تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے جس کے اندر بینک کا وجود ممکن ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ آیا اس معاشی ماحول کو ختم کر دینے کے بعد بھی بینکاری ممکن رہتی ہے یا نہیں، نیز کیا اس معاشی ماحول کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنا ممکن ہے یا نہیں بینک کی اسلامیت کا امکان ثابت کرنے کے لیے دو شرائط کا پورا ہونا لازم ہے:

(۱) یہ ثابت کرنا کہ fractional reserve banking اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والا نظام زر شرعاً جائزہ ہے۔

(۲) بینک کے سود کو شرکت ومضاربت کے اصولوں سے تبدیل کرنا ممکن ہے۔

ہم دیکھیں گے کہ اسلامی بینکار دونوں میں سے پہلی شرط سے کلیتاً سہو نظر کرتے ہوئے بحث کا سارا رخ 'سود' کو 'نفع' سے تبدیل کر دینے کی طرف موڑ دیتے ہیں جبکہ اس دوسری بحث کی نوبت تب آتی ہے جب پہلی شرط پوری ہونا ممکن ہو (جو کہ ہم دیکھیں گے کہ ممکن نہیں ہے)۔ درحقیقت پہلی شرط کا تعلق اس معاشی ماحول سے ہے جس میں بینکاری ممکن ہو پاتی ہے، لہٰذا اس مضمون میں اسی پہلو سے متعلق تفصیلات واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اپنے مضمون کو ہم تین حصوں میں تقسیم کریں گے۔ پہلے حصے میں مجوزین اسلامی بینکاری کا نظریہ بینکنگ بیان کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ہم پاکستان میں اسلامی بینکاری کے سرخیل مولانا تقی عثمانی صاحب کے نظریات کو بنیاد بنائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی ہم علم

معاشیات کی روشنی میں مجوزین اسلامی بینکاری کے نظریہ بینکنگ کی علمی بنیادیں وفکری پس منظر واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ دوسرے حصے میں مجوزین اسلامی بینکاری کے نظریہ بینکنگ کی بنیادی خامیاں نیز بینکنگ کا مختصر تاریخی ارتقاء بیان کرکے درست نظریہ بینکنگ کی وضاحت کی جائے گی۔اس تجزیئے کے بعد آخری حصے میں بینکاری نظام کی اسلامیت اوراس کے امکانات کا مختصر جائزہ پیش کرکے دفاع بینکاری کی چند دلیلوں کا جواب دیا جائے گا۔وما توفیقی الا باللہ

۱) مجوزین اسلامی بینکاری کے نظریہ بینکنگ کی فکری بنیادیں

مجوزین اسلامی بینکاری اوپر بیان کردہ جس تصور بینکنگ کو بنیاد بنا کر بینک کی اسلام کاری ممکن سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت علم معاشیات کے نیوکلاسیکل مکتبہ ہائے فکر سے ماخوذ ہے(۳) جو سرمایہ دارانہ معیشت کو ایک Barter اکانومی کے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔اس مکتبہ فکر کے مطابق معاشی لین دین میں زر ایک غیر فعال (neutral) سیال کے طور پر کام کرتا ہے، نیز بینک محض بچتوں اور سرمایہ داری میں توازن پیدا کرنے کا ایک ادارہ ہے۔ گویا ان مفکرین کے خیال میں بینکنگ 'بچتیں سرمایہ کاری کو جنم دیتی ہیں' (savings create loan model) کے اصول پر کام کرتی ہے۔اس نکتے کی تفصیل سے قبل ہم مولانا تقی عثمانی صاحب کی کتاب 'اسلام اور جدید معیشت وتجارت' سے ان کا نظریہ بینکاری واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

۱.۱: مجوزین کا نظریہ زر و بینکاری

مولانا کا نظریہ بینکنگ درج بالا تصور کی ہو بہو تصویب ہے۔(۴) چونکہ نظریہ زر و بینکنگ باہم مربوط تصورات ہیں، لہذا پہلے ہم مولانا کا نظریہ زر بیان کرتے ہیں۔چنانچہ مولانا تقی عثمانی صاحب زر کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں:

''جو چیز آلہ مبادلہ (exchange of goods) کے طور پر استعمال ہوتی ہو اور قدر کا پیمانہ (unit of account) ہو اوراس کے ذریعے مالیت کو محفوظ کیا جاتا (store of value) ہو اسے زر کہتے ہیں۔'' (ص:۹۵)

پھر نوٹ کی فقہی حیثیت پر مختلف نظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نقطہ نظر کہ 'نوٹ قرض کی رسیدیں ہیں' کو رد کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''صحیح نقطہ نظر یہ ہے کہ نوٹ رسید نہیں بلکہ خود مال ہیں، سونے چاندی کی طرح ثمن حقیقی نہیں بلکہ ثمن عرفی ہیں۔'' (ص:۱۰۴-۱۰۶) اس سے معلوم ہوا کہ مولانا تقی عثمانی صاحب کے نزدیک مروّجہ رائج زر جسے fiat money کہتے ہیں، بنیادی طور پر قرض کی رسید نہیں بلکہ آلہ مبادلہ اور ثمن عرفی ہے۔پھر مولانا بینکاری کی بحث اس تعریف سے شروع کرتے ہیں:

''بینک ایک ایسے تجارتی ادارے کا نام ہے جو لوگوں کی رقمیں اپنے پاس جمع کرکے تاجروں، صنعت کاروں اور دیگر ضرورت مند افراد کو قرض فراہم کرتا ہے۔'' (ص:۱۱۵)

''بینک عوام کی بچتوں کو یکجا جمع کرکے تاجروں اور صنعت کاروں کو سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔'' (غیر سودی بینکاری: ص ۳۱)

''بینک۔۔۔لوگوں کی منتشر بچتوں کو یکجا کرکے انہیں صنعت وتجارت میں استعمال کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔۔۔بینک کی

حیثیت محض ایک ایسے ادارے کی ہے جو روپے کا لین دین کرتا ہے۔" (ص:۱۳۳۔۱۳۴)

ان اقتباسات سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اولاً مولانا تقی عثمانی صاحب کے نزدیک بینک کا بنیادی مقصد سرمایہ کاروں (investers) اور بچت کرنے والوں (savers) کے درمیان تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے۔ دوئم بینک محض زر کی لین دین (exchange of money) سرانجام دینے کا ذریعہ ہے۔ پھر مولانا کھاتوں (deposits) کی مختلف اقسام (کرنٹ اکاؤنٹ، سیونگ اکاؤنٹ، فکسڈ اکاؤنٹ) کا تعارف کرانے کے بعد فرماتے ہیں کہ جب ان ڈپازٹس سے بینک کے پاس سرمایہ جمع ہوجاتا ہے اور اس کے ساتھ بینک بھی اپنا ابتدائی سرمایہ لگا دیتا ہے تو اس تمام سرمایے کو درج ذیل طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے:

۱۔ سرمایے کا ایک حصہ سیال شکل میں اسٹیٹ بینک کے پاس جمع کرادیا جاتا ہے۔

۲۔ بینک کچھ سرمایہ اپنے پاس رکھتے ہیں تاکہ کھاتے داروں کے مطالبات پورے کرسکیں۔

۳۔ اس کے بعد بینک کئی وظائف ادا کرتے ہیں، مثلاً تمویل (financing)، درآمدات و برآمدات میں ادائیگی کی سہولت فراہم کرنا، تخلیقِ زر۔ (ص:۱۱۶)

اس تفصیل سے یہ اہم بات معلوم ہوئی کہ مجوزین کے نزدیک بینک پہلے بچتیں جمع کرتا ہے اور پھر انہیں قرض پر دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بینک 'بچتیں قرضوں کا باعث بنتی ہیں' کے اصول پر کام کرتا ہے۔ اس مقام پر یہ تضاد بھی نوٹ کرلینا چاہیے کہ ایک طرف تو مولانا تقی عثمانی صاحب بینک کا کام یہ بتاتے ہیں کہ 'بینک محض زر کی لین دین کرتا ہے' مگر ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ 'بینک کے وظائف میں تخلیق زر بھی شامل ہوتا ہے' ظاہر ہے اگر بینک محض زر کی لین دین (exchange of money) کرتا ہے تو تخلیق زر (creation of money) کسی بھی طرح اس کے وظائف میں شامل نہیں ہوسکتا، کیونکہ تخلیقِ زر کسی بھی طرح 'زر کی لین دین' میں شامل نہیں کیا جاسکتا اور اگر بینک تخلیقِ زر کا باعث بنتا ہے تو بینک کی یہ تعریف درست نہیں کہ وہ محض زر کی لین دین کرتا ہے، اس تضاد کو رفع کرنے کی ذمہ داری مجوزین کی ذمہ ہے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ مجوزین کی اس تضاد کی وجہ ان کا بینکاری نظام اور تخلیقِ زر کی اصل حقیقت کو درست طور پر نہ سمجھ پانا ہے۔ المختصر مجوزین کے نظریۂ زر و بینکاری کو ہم تین نکات میں سمو سکتے ہیں:

i) موجودہ دور میں رائج شدہ زر 'آلۂ مبادلہ' (means of exchange) ہے، جسے شرعاً ثمنِ عُرفی کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے

ii) بینک سرمایہ کاروں اور بچت کرنیوالوں کے درمیان تعلق پیدا کرتا ہے، یعنی بینک محض زر کا لین دین سرانجام دیتا ہے۔ اس بات کو علمِ معاشیات کی اصطلاح میں یوں کہا جائیگا کہ بینک اصلاً ایک financial intermediary (ترسیل زر کے ثالث) کا کردار ادا کرتا ہے۔

iii) بینک، 'بچتیں قرضوں کا باعث بنتی ہیں' کے اصول پر کام کرتا ہے۔

بینکاری کا یہ روایتی تصور درج ذیل تصویر میں دکھایا گیا ہے، جس کے مطابق فرد الف (عموماً صارفین) سے رقم وصول کر کے فرد ب (عام طور پر سرمایہ کار) کو قرض فراہم کرتا ہے۔ اس کے بدلے بینک ب سے چند فیصد سود لے کر اس سود کا ایک حصہ الف کو دیتا ہے اور سود کی وصولی و ادائیگی کا یہ فرق اس کی آمدنی ہوتی ہے۔ مجوزین کیا سلامی بینکاری کا ماڈل شکل نمبر (۲) میں دکھایا گیا ہے۔

شکل نمبر (۱) مجوزین کا مروجہ بینکاری کے بارے میں نظریہ

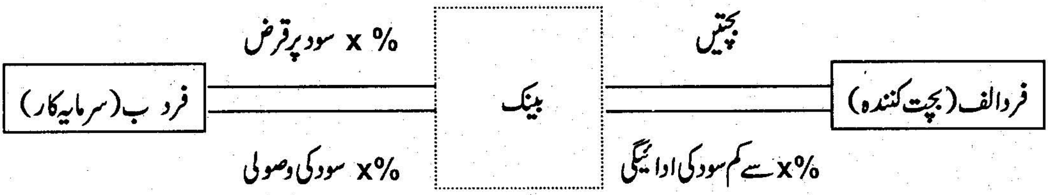

شکل نمبر (۲) مجوزین کے اسلامی بینکاری کا ماڈل

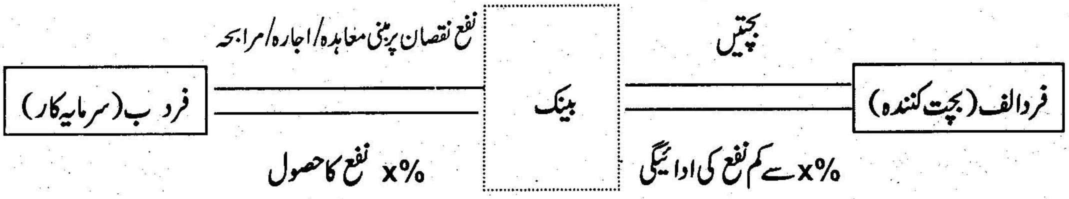

مجوزین اور نیو کلاسیکل اکنامکس کے نظریات کا تعلق

اب ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ مجوزین اسلامی بینکاری کا درج بالا نظریہ بینکاری درحقیقت علم معاشیات کے (ردشدہ) مکتبہ فکر نیو کلاسیکل اکنامکس نظریات کا ہو بہو چربہ ہے۔ نیو کلاسیکل اکنامکس پورے معاشرے کو ایک مارکیٹ کے طور پر دیکھتی ہے جہاں اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل میں مصروف افراد اشیاء کی لین دین کے لئے دوسرے افراد کے ساتھ تعلقات استوار کرتے ہیں۔ نیو کلاسیکل نظریے کے مطابق ایک Barter (اشیاء کی براہ راست لین دین پر مبنی) اکانومی اور momentary (زر پر مبنی) اکانومی میں اصلاً کوئی فرق نہیں، یعنی دونوں میں اشیاء کی اصل قیمتیں اور مقداریں یکساں متعین ہوتی ہیں۔ ان مفکرین کے خیال میں لوگ اشیاء کی براہ راست لین دین کے بجائے زر کو اس لئے ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اشیاء کے تبادلے میں متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً سامان کے نقل و حمل میں مشکلات، طلب و رسد کا ایک ساتھ ملاپ لازم ہونا (یعنی اگر ایک شخص گندم بدلے میں مرغی لینا ہے تو ضروری ہے کہ دوسرا شخص مرغی کے بدلے گندم لینے کیلئے تیار ہو) وغیرہ۔ لہٰذا زر کے استعمال سے مارکیٹ کی استعداد کار (efficiency) میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اشیاء کا تبادلہ تیز رفتاری سے ممکن ہو پاتا ہے۔ چنانچہ زر کے ذریعے ایک طرف اشیاء کا تبادلہ ہوتا ہے اور دوسری

طرف ان کی قدر کی نقدی اکائیوں (monetary units) میں پیمائش ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ایک کلو گندم کی قیمت 30 روپے ہو اور ایک کلو چینی کی قیمت 60 روپے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک کلو گندم کی قدر آدھا کلو چینی جبکہ ایک کلو چینی کی قدر دو کلو گندم ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں زر کا کام اشیاء کی باہمی قدر کو نقدی اکائیوں میں بیان کرتا ہے۔

نیوکلاسیکل زر کے درج بالا تصور (کہ اصلاً یہ آلہ مبادلہ ہے) سے دو اہم نتائج اخذ کرتے ہیں۔

☆ اولاً یہ کہ زر ایک غیر فعال (neutral) سیال ہے، یعنی زر کے زیادہ یا کم ہونے سے اشیاء کی مقدار (quantities) میں کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ محض ان کی قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بطور ایک سادہ مثال فرض کریں کسی ملک میں محض دس کلو گندم پیدا ہوئی اور 100 روپے کرنسی جاری کی گئی (۵)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گندم کی قیمت 10 روپے فی کلو متعین ہوگی۔ اگر کرنسی کی مقدار بڑھا کر 200 روپے کر دی جائے مگر گندم کی مقدار میں کوئی تبدیلی نہ آئے تو گندم کی قیمت بڑھ کر 20 روپے ہو جائے گی اتنے ہی تناسب قیمتوں میں اضافہ ہو جائے گا۔

☆ ثانیاً زر ایک exogenous (لین دین کے عمل سے ماوراء) عنصر ہے یعنی اسکی مقدار اشیاء کی لین دین سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ یہ اس سے باہر اور علاوہ متعین ہوتی ہے۔ یہ سوال کہ اس کی مقدار کون اور کیسے متعین کرتا ہے نیوکلاسیکل مفکرین کے خیال میں یہ ذمہ داری ریاست (state) ادا کرتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مرکزی بینک (Central Bank) ریاست کو قرض دیتی ہے جو دو میں سے کسی ایک شکل میں ہوتا ہے (ا) مرکزی بینک T.Bill (۲) جاری کرتی ہے جنہیں مختلف فائنانشل ادارے وغیرہ خریدتے ہیں اور اس طرح حکومت قرض حاصل کرتی ہے، (۲) مرکزی بینک براہ راست نوٹ جاری کر کے حکومت کو قرض دیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں زر بصورت قرض تخلیق ہوتا ہے (۷)۔ اکثر و بیشتر یہ قرض حکومت کا مالیاتی خسارہ (fiscal deficit) پورا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ درحقیقت آج جسے زر قانونی (legal tender or fiat money) کہا جاتا ہے وہ یہی قرضہ ہے (۸)۔ دھیان رہے کہ مرکزی بینک T.bills اور نوٹوں کی صورت میں یہ قرضہ کسی حقیقی اثاثے کی بنیاد پر نہیں بلکہ بلا کسی عوض تخلیق کرتا ہے نیز یہ قرضہ کسی بھی چیز کی ملکیت (ownership) کی رسید یا دعوی (claim) نہیں ہوتا بلکہ اس کی حیثیت محض 'قانونی دستاویز' کی ہے جسے ریاست 'بذریعہ قانونی جبر' لین دین کے عمل کے لیے قابل قبول بناتی ہے (۹)۔ اوپر ذکر کیا گیا کہ اکثر و بیشتر حکومتیں اپنا مالیاتی خسارہ کم کرنے کے لیے نوٹ (fiat monet) چھاپ کر جاری کرتی ہیں۔ جیسا کہ درج بالا بحث سے واضح ہوا کہ نیوکلاسکل مفکرین کے مطابق اگر زر کی مقدار میں اضافہ کر دیا جائے تو اس کے نتیجے میں اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے (۱۰)۔ قیمتوں میں اضافے سے زر کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً عام لوگ جو حکومت کے شائع کردہ نوٹ استعمال کرتے ہیں ان کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے اور اس کمی کے برابر اصل اشیاء و خدمات حکومت کو منتقل ہو جاتی ہیں۔ زر کی مقدار بڑھنے سے بوجہ افراط زر جو قوت خرید زر استعمال کرنے والے فرد سے زر تخلیق کرنے والے ایجنٹ کی طرف منتقل ہوتی ہے اسے افراط زر ٹیکس (inflation tax) کہا جاتا ہے۔ (اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے، کیونکہ ذیل میں ہم اسے زیر بحث لائیں گے۔

اب تک نیوکلاسیکل نظریہ زر بیان کیا گیا اب ہم اس سے اخذ ہونے والا نظریہ بینکنگ واضح کرتے ہیں۔ نیوکلاسیکل مفکرین کے خیال میں بینک کا بنیادی کام بچتوں کو یکجا کر کے کاروباری حضرات کی سرمایہ کاری کے لئے فراہم کرتا ہے یعنی اس کا کردار بچت کرنے والوں اور سرمایہ کاری کرنے والوں کے درمیان زری ثالثی (financial intermediary) کا ہے۔ اس تصور بینکنگ کے خدوخال درج ذیل ہیں (۱۱):

الف: لوگوں کی بچتوں کو قرض پر دینے سے 'پہلے' ڈپازٹ کی صورت میں جمع کیا جاتا ہے۔ بینک کے پاس ڈپازٹ تب آتے ہیں جب کوئی شخص اپنی بچت بینک کے پاس جمع کراتا ہے۔ بینک ان بچتوں کو سرمایہ کاری کے لئے بطور قرض (اسلامی بینکاری کی اصطلاح میں بطور بیع) فراہم کرتا ہے۔

ب: معاشی توازن (macroe conomic equilibrium) قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ بچتیں سرمایہ کاری کے برابر ہوں (۲۱)، چونکہ بینک بچتوں اور سرمایہ کاری کے درمیان واسطے کا کام کرتے ہیں لہٰذا بینکاری نظام کا 'درست طرز عمل' پورے معاشی عمل کے توازن کو برقرار رکھنے کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے،

ج: بینکنگ کا درست طرز عمل یہ ہے کہ وہ 'بچتوں سے زائد قرضے جاری نہ کرے'، یعنی اس کے مجموعی قرضے اسکی مجموعی بچتوں سے زیادہ نہ ہوں۔ جب کبھی بینک اس اصول کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ پورے معاشی عمل کو عدم توازن سے دوچار کرے گا۔

د: اگر بینک اس اصول پر کاربند رہے تو اس کے عمل سے زر کی مقدار میں بحیثیت مجموعی کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

۲) مجوزین کے نظریہ بینکاری کا جائزہ

اس مختصر وضاحت کے بعد ہم درج بالا نظریہ بینکنگ (جو درحقیقت مجوزین اسلامی بینکاری کا نظریہ بینکنگ بھی ہے) کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ بحث کو سادہ اور عام فہم رکھنے کیلئے حدامکان تک علم معاشیات کے ٹیکنکل مواد سے صرف نظر کرنے کی کوشش کی جائے گی، اسی لئے بہت سی دیگر تفصیلات کو نظرانداز کرتے ہوئے ہم درج بالا تصور بینکنگ کی دو خامیوں پر اکتفا کریں گے (۱۳)۔

ا۔۲: نیوکلاسیکل نظریہ بینکنگ کی بنیادی خامیاں:

نیوکلاسیکل مفکرین کا یہ اصول کہ 'بینک کو بچتوں سے زائد قرض فراہم نہیں کرنے چاہیے' ان مفروضوں پر مبنی ہے کہ (۱) چونکہ بینک کے قرضوں کا منبع لوگوں کی بچتیں ہوتی ہیں لہٰذا بچتوں کے بغیر بینک قرض نہیں دے سکتا، نیز (۲) اس کے قرضے بچتوں کے برابر ہو سکتے ہیں۔ ذیل میں ان دونوں دعووں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

بینک کے قرض بچتوں کے برابر ہوسکنے کا دعویٰ

اس بینکاری نظام (جسے Fractional reserve banking کہتے ہیں) میں بینکوں کے قرض اس کی بچتوں کے برابر ہونا ایک امر محال ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بینک اپنے قرض لوگوں کی بچتوں سے نہیں دیتا بلکہ وہ 'بلا کسی عوض'

(out of nothing) قرض دے کر تخلیق زر کا باعث بنتا ہے۔(اس عمل کی مکمل تفصیل مضمون کے ضمیمے میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے یہاں صرف خلاصہ بیان کیا گیا ہے) محض دو باتوں پر غور کر لینے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے:

اولاً ایک شخص مثلاً زید جب بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھلواتا ہے تو وہ اپنی رقم (Liquidity) خرچ کرنے سے دستبردار نہیں ہوجاتا بلکہ وہ 'کسی بھی وقت' اپنی جمع شدہ کل رقم کے برابر 'قوت خرید' استعمال کر سکتا ہے (چاہیے یہ استعمال بذریعہ چیک ہو یا Debit کارڈ)۔ ثانیاً بینک جب کسی شخص مثلاً ناصر کو نیا قرض جاری کرتا ہے تو وہ زید کے اکاؤنٹ سے کوئی رقم منہا نہیں کرتا بلکہ ناصر کو نئی قوت خرید دیتا ہے۔فرض کریں زید بینک الف میں سو روپے جمع کراتا ہے اور اب وہ کسی بھی وقت سو روپے تک چیک لکھ کر اشیاء خرید سکتا ہے۔ (اس مثال میں سمجھانے کے لیے مجوزین کے اس مفروضے کو درست تسلیم کر لیا گیا ہے کہ بچت قرضوں سے پہلے آرہی ہے جبکہ یہ بھی غلط ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے)۔اب فرض کریں بینک ناصر کو پچاس روپے کی قوت خرید (Liquidity) قرض دیتا ہے، اگر تو یہ پچاس روپے زید کے اکاؤنٹ سے نکال کر دیئے گئے ہوتے تو بینک زید کے اکاؤنٹ کو پچاس سے منہا کر دیتا مگر بینک ایسا کبھی نہیں کرتا بلکہ زید اب بھی سو ہی روپے کی قوت خرید کا مالک رہتا ہے اور ناصر کو بھی پچاس روپے مل جاتے ہیں۔ظاہر ہے جو پچاس روپے ناصر کو دیئے گئے ہیں وہ یا تو ناصر کے پاس ہونگے یا پھر بینک کے اس رقم کا ایک ساتھ دو لوگوں کی ملکیت میں ہونا محال ہے۔عموماً بینک قرض اکاؤنٹ کی شکل میں دیتا ہے یعنی ہماری مثال میں وہ ناصر کا پچاس روپے کا اکاؤنٹ کھول کر اسے بذریعہ چیک پچاس روپے تک خریداری کی اجازت دے گا۔یوں مجموعی اکاؤنٹس بڑھ کر ایک سو پچاس روپے ہو جاتے ہیں (یعنی سو زید کے اور پچاس ناصر کے)۔دیکھیے یہاں بچت تو سو روپے ہی رہی مگر زید و ناصر دونوں کے ڈپازٹس بڑھ کر ایک سو پچاس روپے ہو گئے۔لہذا جب بینک قرض دیتا ہے تو وہ ایک شخص سے قوت خرید لے کر کسی دوسرے شخص کو نہیں دیتا بلکہ نئے سرے سے قوت خرید تخلیق کرتا ہے اور یہ قوت خرید بینک بلا کسی عوض تخلیق کرتا ہے جس کے بدلے دینے کیلئے اس کے پاس (سوائے ایک ناممکن الوقوع جھوٹے وعدے کے) کچھ نہیں ہوتا (۱۴)۔

ایک اہم غلط فہمی کا ازالہ :

مجوزین اسلامی بینکاری کو یہ غلط فہمی لاحق ہے کہ چونکہ وہ قرض کے بجائے اثاثوں پر مبنی بینکنگ کرتے ہیں، لہذا اسلامی بینکاری درج بالا تمام برائیوں سے پاک بینکنگ ہے۔مجوزین کا یہ دعویٰ محض سطح بینی کا نتیجہ ہے۔اوپر دی گئی مثال میں فرض کریں زید سو روپے بینک میں جمع کرواتا ہے اور اب ناصر اسلامی بینک کے پاس آکر مشین خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے جس کی قیمت پچاس روپے ہے۔

اسلامی بینک ناصر سے بیع مرابحہ کر کے پچاس روپے کی مشین ساٹھ روپے میں بیچ دیتا ہے۔فرض کریں یہ مشین صہیب سے خریدی گئی تھی۔ اب صورت حال یہ ہوگی:

☆ زید کے پاس بدستور سو روپے کی قوت خرید موجود ہے یعنی وہ سو روپے تک اشیاء خرید سکتا ہے۔

☆ ناصر اسلامی بینک کا مقروض ہوگیا۔

☆ صہیب پچاس روپے کی قوت خرید کا مالک بن گیا۔

دیکھیے یہاں پھر وہی صورت حال درپیش ہے جو اوپر بیان کی گئی۔ دونوں میں فرق 'نوعیت مسئلہ اور نتیجے' کا نہیں بلکہ محض کاروائی درج کرنے کے طریقے کا ہے یعنی جو کام عام بینک ایک کاروائی میں کرتے ہیں اسلامی بینک اسے دو اندراجوں میں مکمل کرتے ہیں۔ عام بینکوں میں ناصر بینک کا مقروض ہونے کے ساتھ پچاس روپے کی (فرضی) قوت خرید کا مالک بھی بن جاتا ہے جبکہ اسلامی بینکوں میں یہ قوت خرید ناصر کے بجائے صہیب کو ملتی ہے جس طرح عام بینک یہ قوت خرید کسی عوض کے بغیر محض کمپیوٹر کی یاداشت (memory) میں ایک نمبر تحریر کرکے تخلیق کرتے ہیں، اسی طرح اسلامی بینک بھی یہی کام کرتے ہیں۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے یعنی 'بلا کسی عوض قرض پر مبنی زر کی تخلیق' (مزید تفصیل ضمیمے میں)۔ چنانچہ یہ خیال کہ اثاثوں پر مبنی بینکاری سے تخلیق زر کی صورت پیدا نہیں ہوتی، قلت تدبر کا نتیجہ ہے، سادہ سی بات کہ عام بینک بھی جو قرض جاری کرتے ہیں، قرض خواہ ان سے بھی کسی نہ کسی اثاثے کی خرید وفروخت عمل میں لاتے ہی ہیں، یہاں فرق صرف اتنا ہو رہا ہے کہ قرض خواہ کے بجائے اسلامی بینک خود اس فرضی قوت خرید سے خرید وفروخت کا معاملہ کرتا ہے اور بس۔

یہ غلط فہمی کہ اثاثوں پر مبنی بینکاری سے تخلیق زر کی صورت پیدا نہیں ہوتی اس خیال سے بھی پیدا کی جاتی ہے کہ چونکہ روایتی بینک بیع کے بجائے اپنے گاہک کو اکاؤنٹ (deposit) کی صورت میں قرض دیتے ہیں، اسی وجہ سے یہ جعلی زر تخلیق کرتے ہیں، اس کے مقابلے میں اسلامی بینک چونکہ اثاثے کی خرید کے لیے پوری قیمت ادا کردیتے جسکے نتیجے میں قوت خرید اسلامی بینک کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے لہذا یہ اس برائی سے پاک ہیں۔ درحقیقت یہ دعویٰ بھی اصل معاملے پر غور نہ کرنے کا ہی کا نتیجہ ہے کیونکہ تخلیق زر کا تعلق اس بات سے نہیں کہ آیا بینک کرنسی کی صورت میں کوئی ادائیگی کرتا ہے یا نہیں بلکہ اس امر سے ہے کہ ادا کردہ رقم پوری یا اس کا ایک حصہ دوبارہ بینکنگ نظام میں واپس آتا ہے یا نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو معاملہ یوں بنتا ہے کہ اسلامی بینک جو قیمت ادا کرتا ہے وہ دو میں سے کسی ایک حال سے خالی نہیں ہوتی، فرض کریں اسلامی بینک ٹویوٹا کمپنی سے دس لاکھ روپے مالیت کی ایک گاڑی خریدتا ہے:

۱) یا تو چیک کی صورت ہی میں ادا کی جاتی ہے، یہ زیادہ آیا ہے، یعنی اسلامی بینک ٹویوٹا کمپنی کو اپنا جاری کردہ دس لاکھ روپے مالیت کا چیک دیتا ہے جسے ٹویوٹا کمپنی اپنے بینک میں بھیج کر رقم منتقل کروالیتی ہے۔ اس صورت میں پوری ادا کردہ رقم دوبارہ بینکنگ نظام میں واپس آجاتی ہے اور یوں بینکاری نظام مجموعی طور پر دس لاکھ روپے کے نئے ڈپازٹ تخلیق کردیتا ہے کیونکہ اس ادائیگی کے بعد بینک اپنے کسی بھی گاہک کی قوت خرید کو منہا کیے بغیر کمپنی کے کھاتے میں دس لاکھ روپے جمع کردیتا ہے۔

۲) زیادہ تر قیمت کی ادائیگی اوپر بیان کردہ یعنی بینک چیک کی صورت ہی میں ادا کی جاتی ہے، مگر اس کا امکان یہ ہے کہ اس کا دوسرا امکان یہ ہے کہ اسلامی بینک یہ قیمت کرنسی کی صورت میں ادا کرے یعنی اسلامی بینک ٹویوٹا کمپنی سے دس لاکھ روپے مالیت کی گاڑی بعوض کرنسی خرید لیتا ہے۔ اس صورت میں کمپنی یا تو پوری کی پوری رقم یا اس کے محض ایک حصے کو اپنے پاس کیش کی صورت میں رکھ کر بقیہ (فرض کریں آٹھ لاکھ روپے) کو اپنے بینک کاؤنٹ میں جمع کرادیتی ہے اور یوں پھر پہلی صورت ہی کی طرح نئے ڈپازٹ تخلیق ہوجاتے ہیں۔

یہاں یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ کمپنی پوری کی پوری قیمت کو بصورت کیش اپنے پاس رکھ لے۔ اس میں شک نہیں کہ کمپنی کیلئے ایسا کرنا ممکن ہے، مگر یہ طرزِ عمل بینک کے کسی ایک گاہک کیلئے تو تصور کیا جا سکتا ہے لیکن اگر تمام لوگ اسی طرح ہر معاہدے کے بعد ادا کردہ کیش اپنے پاس رکھنے لگیں اور ہر بیع بعوض کیش ہی کرنے لگیں تو بینک دیوالیہ ہو جائیں گے۔ ایسا اس لئے کہ اگر رقم یوں ہی بینکوں سے نکلتی رہے تو بینک اپنے کھاتے داروں کو رقم کی ادائیگی کہاں سے کرے گا؟ لہٰذا یہ سمجھنا کہ اسلامی بینکوں کا اثاثوں پر مبنی بینکنگ کرنا نہیں روایتی بینکوں سے ممیز کر دیتا ہے ایک غلط فہمی کے سواء اور کچھ نہیں کیونکہ تخلیق زر کے عمل کا تعلق بذریعہ قرض یا بیع بینکاری کرنے سے نہیں بلکہ Fractional reserve banking (اصل زر کے محض ایک مخصوص حصے کو بطور کرنسی اپنے پاس رکھنے) کے اصول سے ہے۔

بینک ڈپازٹ کی قرض پر اولیت کا دعویٰ

اب تک کی بحث سے یہ واضح ہو جانا چاہیے مرکزی بینک ہو یا کمرشل بینک دونوں جس زر کو تخلیق کرتے ہیں، وہ 'قرض' کی رسید (Promise of payment) سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا (اور وہ بھی ایسا قرض جس کا عوض ادا کرنا ناممکن الوقوع ہوتا ہے جیسا کہ ضمیمے سے واضح ہے) یہی وجہ ہے کہ موجودہ مالیاتی وزری نظام کو Debit or Credit Money System (قرض پر مبنی نظام زر) کہتے ہیں۔ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سمجھنا بالکل آسان ہو جاتا ہے کہ بینک 'بچتیں قرض کا باعث بنتی ہیں' کے بجائے قرضے ڈپازٹس کو جنم دیتے ہیں' (loans create deposits mode) کے اصول پر کام کرتا ہے (اور کر سکتا ہے)۔ ہم دیکھیں گے کہ ایک بینک اکاؤنٹ قائم ہونے سے 'قبل' ایک قرض تخلیق ہونا ضروری امر ہے۔ سادہ تفہیم کے لیے (۱۵) بات یہاں سے شروع کرتے ہیں کہ فرض کریں ایک شخص (زید) کسی خدمت کے عوض حکومت سے نوٹ (legal tender) وصول کرتا ہے۔ اس موقع پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ شخص اس رقم (یا اس کے ایک حصے) کو کسی کمرشل بینک میں جمع کراتا ہے تو یہ اکاؤنٹ بنا کسی ماقبل قرض قائم ہو جائے گا، لہٰذا ثابت ہوا کہ ڈپازٹ قرض سے ماقبل ہوتا ہے۔ یہ خیال درست نہیں کیونکہ سوال یہ ہے کہ حکومت نے زید کو یہ رقم کس مد سے ادا کی؟ اس کا جواب دو میں سے کسی ایک صورت سے ہو سکتا ہے:

۱۔ اگر یہ قوت خرید ٹیکسوں کی آمدنی سے ادا کی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکومت نے عوام کی قوت خرید عوام کو واپس لوٹا دی (کیونکہ ٹیکس کی آمدن عوام سے ہی وصول کی گئی تھی)۔ اس صورت میں زر کی مقدار حکومت کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور کسی قسم کی کوئی قوت خرید وجود میں نہیں آئے گی۔ دوسرے لفظوں میں اس صورت حال میں گویا ہم ایک غیر سرمایہ دارانہ مالیاتی نظام میں ہونگے جہاں نہ تو تخلیق زر کا عمل ہوگا اور نہ ہی زر اعتباری کا کوئی وجود، لہٰذا کمرشل بینک بھی کوئی ڈپازٹ لینے کے لائق نہ ہوں گے (اس لیے کہ ڈپازٹ قائم کر کے وہ زر اعتباری یعنی 'بینک ڈپازٹس' ہی تو تخلیق کرتے ہیں)۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حکومت نے یہ رقم نئے نوٹ وغیرہ چھاپ کر ادا کی، مگر اوپر ہم دیکھ آئے ہیں کہ نوٹ

چھاپنے کا مطلب حکومت کا خود کو قرض دینا ہوتا ہے کیونکہ نوٹ سرکاری قرضہ ہی ہوتا ہے۔لہٰذا اس صورت میں ڈپازٹ سے پہلے قرض پایا گیا۔الغرض بینک ڈپازٹ قائم ہونے کے لیے پہلے قرض کا پایا جانا ضروری ہے۔

ایک دفاع کا ازالہ: مشہور نیو کلاسیکل (زیادہ صحیح الفاظ میں کنیزین) معیشت دان Tobin نے روایتی اصول 'بچتیں قرض کا باعث بنتی ہیں' کا ایک دفاع پیش کرنے کی کوشش کی۔Tobin اس بات پر زور دیتا ہے کہ بینک ڈپازٹ وجود میں آنے کیلئے لازمی شرط یہ ہے کہ معاشرے میں ایک ایسا ایجنٹ (صارف،فرم وغیرہ) موجود ہو جو اس اکاؤنٹ کا مالک بننا چاہتا ہو بصورت دیگر بینک ڈپازٹ کبھی قائم نہیں ہوسکتا۔اس سادہ بحث سے Tobin یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ بینک ڈپازٹ کے وجود کا انحصار بینک کے قرض دینے یا نہ دینے پر نہیں بلکہ فرد کے اس فیصلے پر ہے کہ وہ اپنی دولت کا ایک حصہ بینک اکاؤنٹ کی صورت میں رکھنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اگر تمام افراد اپنی دولت بینک ڈپازٹ کے بجائے کسی دوسری صورت (مثلاً سونا،اشیا یا سیکیورٹیز وغیرہ) میں رکھنے کا فیصلہ کر لیں تو بینک ڈپازٹ کا وجود ختم ہو جائے گا۔لہٰذا Tobin کے خیال میں بینک ڈپازٹ کی مقدار کا تعین بینکوں کے جاری کردہ قرضوں کی مقدار سے نہیں بلکہ بینک ڈپازٹ کی طرف لوگوں کی ترجیحات سے ہوتا ہے۔بظاہر Tobin کی یہ دلیل خاصی وزنی معلوم ہوتی ہے البتہ ذرا غور کرنے سے اس کی غلطی واضح ہو جاتی ہے۔پہلی بات یہ کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگ اپنی دولت کو مختلف شکلوں میں محفوظ رکھنے کی ترجیحات خود طے کرتے ہیں مگر فرد کی اس فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اپنے فیصلے اور ترجیحات سے بینک کے 'مجموعی ڈپازٹس' کی مقدار زیادہ کم کرسکتا ہے۔مثلاً فرض کریں زید اپنی دولت کی حفاظت سے متعلق اپنی ترجیحات کو تبدیل کرنا چاہتا ہے (دھیان رہے کہ اس مثال کا تعلق ایسے مالیاتی نظام سے متعلق ہے جہاں صرف 'بینک زر' بطور زر استعمال کیے جاتے ہیں)۔اگر زید اپنے بینک ڈپازٹ کو بڑھانا چاہتا ہے تو ایسا کرنے کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی دولت کے کسی دوسرے اثاثے (مثلاً اشیا،سونے یا سیکیورٹیز وغیرہ) کو بیچے۔اسی طرح اگر وہ اپنے بینک ڈپازٹ کو کم کرنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ بینک ڈپازٹ سے کچھ رقم نکال کر کوئی دوسرا اثاثہ خرید لے۔زید کے ان دونوں فیصلوں کے روبا عمل ہونے کے لیے معاشرے میں کسی ایسے دوسرے فرد (مثلاً ناصر) کا ہونا ضروری ہے جو زید کے فیصلے کا بالکل الٹ کرنے کے لیے تیار ہو۔اس پوری صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجموعی بینک ڈپازٹس کی مقدار جوں کی توں بدستور برقرار رہی جس سے ثابت ہوا کہ بینک کے مجموعی ڈپازٹس کا افراد کی ترجیحات سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ سوال کہ اگر بینک ڈپازٹس کی مقدار میں اضافے یا کمی کا انحصار افراد کی ترجیحات پر نہیں ہوتا تو پھر کس چیز پر ہوتا ہے،تو اس کا جواب ہے بینکوں کا قرض زیادہ یا کم ہو جانا۔ڈپازٹس کی مقدار میں اضافہ تب ہوتا ہے جب بینک قرضوں کی مقدار میں اضافہ کرتا ہے اور کمی اس وقت ہوتی ہے جب فرد ڈپازٹ کی شکل میں بینک کا قرض واپس کرتا ہے۔دوسری بات یہ کہ یہاں دلیل کا رخ یہ نہیں کہ بینک کا ہر قرض لازماً ڈپازٹ کی شکل اختیار کرتا ہے بلکہ یہ ہے کہ بینک ڈپازٹ قائم ہونے سے قبل ایک قرض کا پایا جانا ضروری ہے اور Tobin کی وضاحت اس پہلو کو رد کرنے میں کوئی مدد فراہم نہیں کرتی۔

اس سادہ مثال کے بعد اب ایسے مالیاتی نظام کی مثال لیجئے جہاں بینک ڈپازٹس کے علاوہ زرِ قانونی بھی بطورِ کرنسی استعمال ہوتا ہو یعنی جہاں دو چیزیں بطورِ آلہ مبادلہ (means of payment) چلتی ہوں ایک بینک ڈپازٹس دوسری زرِ قانونی (جیسا کہ دور حاضر کا حال ہے) فرض کریں زید اپنے بینک ڈپازٹ کی مقدار کم کر کے زرِ قانونی کی زیادہ مقدار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ اگر ڈپازٹس کے بجائے کرنسی کی ترجیح میں اضافہ ہو جائے تو بینکوں کی قرض دینے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے (دیکھئے ضمیمہ) لہٰذا اس صورت میں بینک اپنے قرض اور نتیجتاً ڈپازٹس کم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ مگر قرضوں میں کمی کا یہ عمل ڈپازٹس میں کمی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ بینک قانوناً اس پر مجبور ہوتے ہیں کہ انہیں Reserves کی ایک کم از کم مقدار اپنے پاس محفوظ رکھنا ہوتی ہے۔

قرضوں کے پس پشت ڈپازٹس کا وجود ثابت کرنے کا آخری امکان یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی لوگوں کی اپنی بچت ڈپازٹس کی صورت میں جمع کرنے کی ترجیح میں اضافہ ہو جائے (یعنی مثلاً پہلے اگر وہ دس فیصد ڈپازٹس میں رکھتے تھے تو اب بیس فیصد رکھنے لگے)۔ ایسی صورت حال میں عموماً بینکوں کے جاری کردہ قرض زیادہ ہو جاتے ہیں جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ بینک قرض اپنے ڈپازٹس سے جاری کرتا ہے۔ البتہ یہ امکان بھی درست نہیں کیونکہ مفروضہ صورت حال کا مطلب یہ ہوا کہ بچتوں کا زیادہ حصہ اب ڈپازٹس کی طرف جانے لگا جبکہ تمسکات (Securitites) وغیرہ کی مد میں محفوظ کیا جانے والا حصہ کم ہو گیا۔ ایسی صورت حال میں کمپنیاں بینکوں سے زیادہ قرض لینے پر مجبور ہوں گی اور یوں وہ زیادہ مقدار میں بینکوں کی مقروض ہو جائیں گی۔ گو یہاں بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بینک کے قرضوں کی مقدار میں اضافہ بینک ڈپازٹس کی طلب بڑھ جانے کی وجہ سے ہوا مگر قرضوں میں یہ اضافہ کمپنیوں کی قرض طلب بڑھ جانے کی وجہ سے ہوتا ہے نہ کہ بچت کی رسد بڑھ جانے سے۔

'بچت قرضوں کا باعث بنتی ہے' کا اصول اپنا لینے کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ معیشت دان 'ایک بینک' کے اس عمل کو سامنے رکھ کر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر بینک زیادہ سے زیادہ reserves اور ڈپازٹس حاصل کرنے کے لیے دوسرے بینکوں سے مسابقت کرتا ہے جس سے یہ محسوس ہوتا ہے گویا قرضے ڈپازٹس سے دیئے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بینک کے reserves بڑھ جانے سے اس کی قرض دینے کی صلاحیت میں اضافے ہو جاتا ہے مگر (ا) یہ اصول کسی 'ایک بینک' کے لیے تو درست ہے البتہ 'بینکنگ بحیثیت مجموعی' کے لیے قابل عمل نہیں کیونکہ بینکوں کے مجموعی ڈپازٹس میں اضافہ صرف اس وقت ممکن ہے جب مرکزی بینک نیا قرض جاری کرے، علی الرغم اس سے کہ یہ قرض ایک بینک کو دیا جائے یا حکومت کو (ب) اس کی وجہ ڈپازٹس کے پس پشت مخصوص مقدار میں reserves رکھنے کی قانونی پابندی سے ہے، اگر اس پابندی کو ختم کر دیا جائے تو بینکوں کی قرض دینے کی صلاحیت لامحدود ہو جائے گی۔ پس ایسا مالیاتی نظام جہاں (۱) زرِ قانونی بطور کرنسی استعمال ہو اور (۲) بینکنگ نافذ العمل ہو، وہاں ہر ڈپازٹ سے 'قبل' ایک قرض کا پایا جانا منطقی لازمہ ہے۔ پس ہم نظام بینکاری کے اصل تصور کو درج ذیل شکل سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس تصویر میں یہ بات دکھائی گئی ہے کہ بینک قرض کی صورت میں قوت خرید کی منتقلی لوگوں کی بچتوں سے نکال کر نہیں دیتا بلکہ محض کمپیوٹر میں

چند اعداد و شمار لکھ کر تخلیق کر لیتا ہے۔ اس قرض پر بینک سود کماتا ہے۔ دوسری طرف بینک کھاتے داروں سے ڈپازٹس وصول کرتا ہے تاکہ بینک کو اپنی فرضی رسیدوں کی پشت پناہی کے لیے کچھ رقم ملتی رہے اور اس کا کاروبار محفوظ طریقے سے چلتا رہے۔ بینک اپنے کھاتے داروں کو رقم کی ادائیگی اس لیے کرتا ہے کہ وہ بینک کے ساتھ مخلص رہیں اور بینک ڈپازٹس کھلواتے رہیں۔

<u>شکل نمبر (۳) بینکاری کا اصل تصور</u>

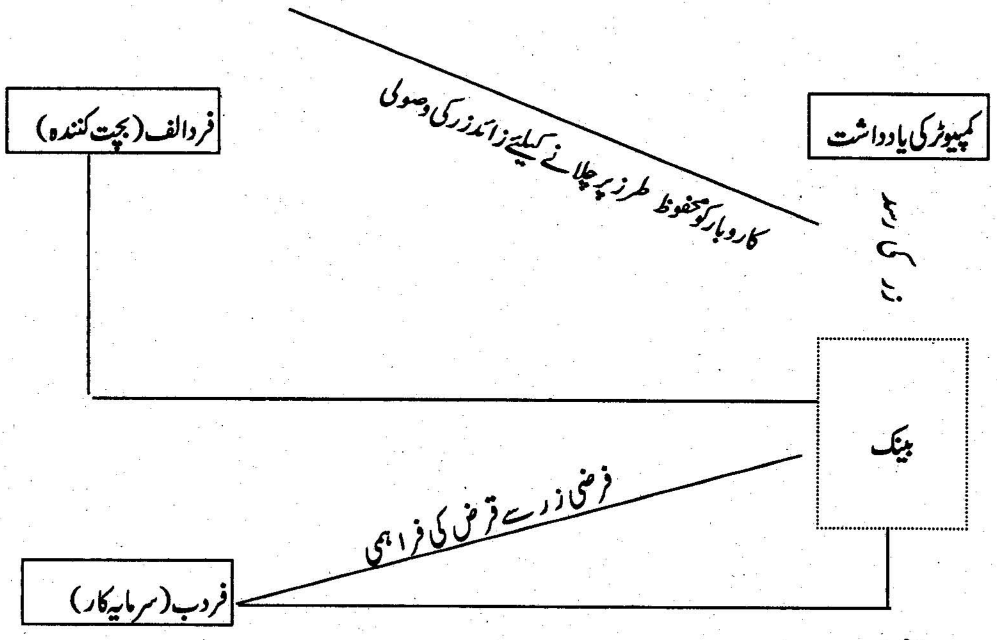

بینکاری تاریخی پس منظر میں:

اس مقام پر موجودہ بینکنگ کو اس کے تاریخی پس منظر میں سمجھنا نہایت ضروری ہے کیونکہ موجودہ بینکاری (بشمول اسلامی بینکاری) نظام اس دھوکے اور جھوٹ پر مبنی ہے جو سولھویں اور سترہویں صدی کے صراف یورپ کے عیسائیوں اور دیگر اہل مذاہب کو دیا کرتے تھے۔ بینکنگ کے ارتقاء کو ہم چند ادوار (Stages) میں تقسیم کر کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں (یہ تقسیم واقعاتی ترتیب کے اعتبار سے نہیں بلکہ محض تفہیم کے نقطہ نظر اختیار کی گئی ہے، تاریخی طور پر یہ سارے ادوار اس ترتیب سے گزرے یا نہیں ایک الگ موضوع ہے)۔

پہلا دور: یورپ میں بینکنگ کا پہلا دور یہ تھا کہ لوگ اپنا سونا و چاندی (زر اصلی) بطور امانت صرافوں کے پاس رکھوا دیتے۔ یہ امانتیں عموماً حفاظتی و سفری ضرورتوں کی بناء پر جمع کرائی جاتی تھیں۔ صرف ان امانتوں کے بدلے صاحب امانت کے نام رسید لکھ دیتے جو اس بات کی ضمانت ہوتی تھی کہ رسید پر درج نامی شخص فلاں مقدار سونے کا مالک ہے جسے وہ جب چاہے صراف سے واپس لے سکتا ہے۔ ابتداً یہ رسیدیں بذات خود زر مال تصور نہیں کی جاتی تھیں، بلکہ محض قرض کی رسید (debit receipts or promise of payment) سمجھی جاتی تھیں۔

دوسرا دور: رفتہ رفتہ یورپ میں ان رسیدوں پر اعتماد بڑھنے کے ساتھ لوگوں نے ہر دفعہ سونا نکال کر اشیا خریدنے کے بجائے براہ راست ان رسیدوں کو اشیا کے تبادلے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ دھیان رہے کہ اب بھی یہ رسیدیں محض 'قرض کی رسیدیں' ہی سمجھی جاتی تھیں مگر اب انہیں بطور سونے کے متبادل' آلہ مبادلہ استعمال کرنا شروع کر دیا گیا۔ (یہیں سے ساری خرابی شروع ہوتی ہے جیسا کہ آگے واضح کیا جائے گا۔)

تیسرا دور: جب یورپی صرافوں نے دیکھا کہ لوگ عموماً رسیدوں ہی سے معاملات کر لیتے ہیں اور سونا نکلوانے کم ہی آتے ہیں تو انہوں نے جمع شدہ سونے کو سود پر ادھار دیکر پیسہ بنانا شروع کر دیا۔ البتہ انہیں اپنی جاری کردہ رسیدوں کا کچھ فیصد سونا بہر حال اپنے پاس رکھنا پڑتا تھا تاکہ اگر کوئی صاحب سونا لینے آئیں تو ان کی یہ طلب فوراً پوری کی جاسکے۔ اس مقام پر آکر ایک اہم فرق رونما ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ 'سونے کے بدلے جاری کردہ قرض کی رسیدیں' اور 'بعینہ وہی سونا' ایک ساتھ 'بطور آلہ مبادلہ استعمال ہونے لگے اور یوں یورپی صراف خفیہ طور پر زر کی رسد بڑھانے کا باعث بننے لگے۔ مثلاً فرض کریں تمام لوگوں نے مجموعی طور پر 100 گرام سونا صرافوں کے پاس جمع کرایا جس کے بدلے 100 رسیدیں (فی رسید ایک گرام سونا کے حساب سے) جاری کر دی گئیں۔ اگر پچاس گرام سونا قرض دے دیا گیا تو ایک طرف قرض خواہ سو رسیدیں (یعنی سو گرام سونا) بطور آلہ مبادلہ استعمال کر رہے ہیں جبکہ دوسری طرف صرافوں کے مقروض پچاس گرام سونا بھی استعمال کر رہے ہیں۔ یوں زر کی کل رسد بڑھ کر 150 گرام سونے کے برابر ہو گئی۔ اس مقام پر پہنچتے ہی گویا بینک پیدا ہو گئے (کہ بینک کا اصل کام زری ثالثی نہیں بلکہ بلا کسی عوض تخلیق زر ہے جیسا کہ واضح کیا گیا)۔ دوسرے لفظوں میں قرض کی رسید (promise of payment) اب دو افراد کا باہمی معاملہ (Private contract) نہیں رہا بلکہ اسے بطور زر عام خریدا اور بیچا جانے لگا۔

چوتھا دور: یہ روش آگے بڑھتی گئی اور لوگ زیادہ بڑی مقدار میں سونا یورپی صرافوں کے پاس جمع کرانے لگے۔ جب ان صرافوں نے غور کیا کہ چونکہ لوگ ہماری کل جاری کردہ رسیدوں کی ایک خاص مقدار (فرض کریں 20 فیصد) سے زیادہ سونا کبھی نکلواتے ہی نہیں نیز لوگ ہماری جاری کردہ رسیدیں کی صورت میں بھی قرض وصول اور ادا کرنا قبول کر لیتے ہیں (کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان رسیدوں کے بدلے اشیاء کی خرید فروخت کے لیے تیار ہیں تو انہیں یہ ترکیب سوجھی کہ سونے کے بجائے رسیدوں کی صورت میں قرض دینا شروع کیا جائے اور چونکہ لوگ جاری کردہ رسیدوں کی محض مخصوص مقدار کے برابر سونا نکلواتے ہیں تو جمع شدہ سونے سے زیادہ رسیدیں جاری کر دینے میں کچھ حرج نہیں، لہذا انہوں نے ایسا کرنا شروع کر دیا۔ فرض کریں اگر سب لوگوں نے مل کر 100 گرام سونا جمع کروایا اور لوگ جاری کردہ رسیدوں کے بیس فیصد سے زیادہ سونا کبھی نہیں نکلواتے تو اس صورت میں صراف 100 گرام سونے کے بدلے 500 گرام' تک' رسیدیں جاری کر سکتے (500 رسیدوں کا بیس فیصد یعنی 100 گرام سونا وہ اپنے پاس رکھتے، گویا 100 گرام سونا 500 رسیدوں کی پشت پناہی کرنے کے لیے کافی ہو سکتا تھا، مزید تفصیل ضمیمے میں دیکھئے)۔

دھیان رہے کہ ان پانچ سو رسیدوں میں سے صرف سو رسیدوں کے برابر سونا اکانومی میں موجود ہوتا جبکہ بقیہ چار سو قرض کی رسیدیں محض فرضی وجعلی طور پر وجود میں لائی جاتیں جن کے عوض ادا کرنے کے لیے صرافوں کے پاس کوئی اثاثہ موجود نہ ہوتا اب نوعیت معاملہ میں یہ واضح تبدیلی آگئی کہ قرض کی جن رسیدوں کو ذریعہ ادائیگی کے طور پر استعمال کیا جانے لگا تھا، ابتداء جب تک ان کے پیچھے مساوی مقدار میں سونا موجود تھا اس وقت تک یہ کسی حقیقی دعوے و وعدے کی رسیدیں تھیں مگر اب یہ محض 'فرضی دعوی و وعدہ بن کر رہ گئیں ایک ایسا وعدہ جسے پورا کرنا عملاً ناممکن الوقوع تھا۔ ظاہر ہے 100 گرام سونا 500 رسیدوں کے بدلے کبھی ادا نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی صرافوں کے کاروبار کا انحصار اس بات پر تھا کہ لوگ کبھی ان کی تمام رسیدوں کے برابر سونے کے طلب نہ کریں، جس دن ایسا ہوا صرافوں کے دھوکے کی پول کھل جائے گی۔

اس مقام پر ذہنوں میں یہ سوال آسکتا ہے کہ بینک رسیدیں لکھ کر اور پھر انہیں قرض پر دیکر سود کمانے کے لیے چکر میں کیوں پڑتے تھے اس کے بجائے وہ ان رسیدوں کو براہِ راست اشیاء وخدمات کی خریداری کے لیے بذاتِ خود کیوں استعمال نہ کرتے؟ درحقیقت یہ حکمت عملی بار آور ثابت نہ ہوسکتی تھی کیونکہ خریدی گئی اشیاء کا مالک ان رسیدوں کے عوض ایک سے سونے کی طلب کرے گا اور بینکوں کے پاس یہ سونا ہی کب تھا۔ چونکہ اس طرح سے خرچ کی گئی رسیدیں گھوم کر پھر انہی بینکوں کے سامنے سونے کی طلب کے ساتھ آنا تھیں لہذا بینکوں کے لیے اپنی ہی تخلیق کردہ رسیدیں خود استعمال کرنا اپنے ہی پیر پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ پس بینکوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان رسیدوں (جو اس وقت زر کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں) کو سود کے بدلے قرض پر دے کیونکہ اس کا فائدہ یہ تھا کہ جب بینکوں کا قرض بذاتِ خود ان رسیدوں کی ہی شکل میں ادا کیا جاتا تھا تو رسیدوں کی صورت میں تخلیق کیا گیا زر خود بخود ختم ہو جاتا اور اس کا کوئی ثبوت باقی نہ رہتا جبکہ بینک اپنا 'نفع' کھرا کر لیتا۔ اسی طرح بینکوں کے لیے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ شرکت وغیرہ کی بنیاد پر قرض دیکر کاروبار کرتے کیونکہ ان کا کاروبار پہلے ہی ایک بڑے خطرے (risk) سے دوچار تھا کہ وہ اصل زر (سونے) کی واپسی کے وعدہ پر اصل سے بہت زیادہ فرضی زر تخلیق کیے بیٹھے تھے اور یہ وعدہ نبھانا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ شرکت پر کاروبار کرنے کا مطلب اپنے اس کاروبار کو دہرے خطرات سے دوچار کرنے کے مترادف ہوتا کہ اگر ان قرضوں پر نقصان ہوا تو بینک کا ذمہ دار ہوگا اور جو سونے کی شکل میں قابل ادا ہوگا۔ اس لیے بینک سودی قرضے دیتے جن سے ایک طرف ان کا نفع یقینی ہوجاتا اور دوسری طرف اصل بھی محفوظ رہتا۔ اس اصل کو مزید محفوظ بنانے کے لیے بینک قرض کے برابر شے بطور رہن رکھوانے کی شرط بھی رکھتے۔ اس طرح یہ ایک محفوظ و مامون کاروبار کی صورت اختیار کرتا چلا گیا (۱۷)۔

یورپ کے اندر اس سارے عمل کے نتیجے میں بینکاری ایک انتہائی 'نفع بخش' (بصورت سود) کاروبار بن گیا کیونکہ معاملہ گویا یہ تھا کہ صرافوں کے ہاتھ زر تخلیق کر کے پیسہ کمانے کا دھندہ آ گیا تھا۔ حالات کا اندازہ لگا کر دیگر چالاک لوگوں نے بھی اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ کاروبار شروع کر دیا۔ اب یورپی صراف قرض کی رسیدیں 'قرض خواہ' کے نام کے بغیر اپنے نام سے جاری کرتے تا کہ ان کی قبولیت مزید بڑھ جائے (جیسے آج کل حکومت وقت کا نوٹ ہوتا ہے جس پر وصول کنندہ کا نام تحریر نہیں ہوتا)۔ اس

کاروبار کے پھیلاؤ اور رسیدوں کے عام استعمال میں آنے سے اکانومی میں قرض پر مبنی زر بڑھنے لگا اور آہستہ آہستہ معاشرے صرافوں (قدیم بینکوں) کے مقروض ہونے لگے (کیونکہ بینک کی جاری کردہ رسید لازماً کسی نہ کسی پر قرض ہی ہوتی ہے)۔ جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا کہ بینکوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی جاری کردہ رسیدوں کا کچھ فیصد سونے کی صورت میں سنبھال رکھیں تا کہ لوگوں کی سونے (آج کل کے محاورے میں Cash) کی روزمرہ ضرورپات پوری کی جاسکیں۔ جب لوگ زیادہ مقدار میں بینک سے سونا نکلواتے تو بینک مصیبت میں پھنس جاتے اور بینک اس طلب کو دوسرے بینکوں سے سونا قرض پر اٹھا کر پورا کرتے۔ یورپ وامریکہ میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جنہیں "Note Wars" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یعنی ایک بینک اپنے مدمقابل بینک کی زیادہ سے زیادہ رسیدیں اکھٹی کر کے اس کے سامنے ایک ہی دن میں ادائیگی کے لیے پیش کرنے کی کوشش کرتا تا کہ دوسرا بینک دیوالیہ ہوجائے اور اس کے لیے میدان صاف ہوجائے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ یہی وہ دور ہے جب یورپ میں سود کے جواز کی فکری وعلمی بنیادیں نیز اس کے 'مذہبی متبادل' فراہم کرنے کی روش عام ہوئی، گویا سود کے جواز متبادل کا مسئلہ کسی علمی وفطری ارتقاء کی وجہ سے نہیں بلکہ بینکنگ کا ادارہ عام ہوجانے کے بعد پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ آج اسلامی معاشیات وبینکاری کے نام پر جس طرح سرمایہ دارانہ اداروں کی تھوک کے حساب سے اسلام کاری کی مہم جاری ہے بعینہ یہی عمل عیسائی یورپ میں 'اصلاح مذہب' کا نعرہ لگانے والے حضرات کر گزرے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں گروہوں کے طریقہ واردات اور دلائل میں بھی حیرت انگیز طور پر یکسانیت پائی جاتی ہے۔

پانچواں دور: یہ دور نجی سطح پر جاری بینکنگ کے حکومتی تحویل ونگرانی میں آکر مرکزی بینک میں تبدیل ہوجانے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ سوال کہ یہ عمل کس طرح رونما ہوا مختلف معیشت دان اس کے مختلف جواب دیتے ہیں۔ نیوکلاسیکل طرز کے معیشت دان جو ہر سرمایہ دارانہ اداراتی تنظیم کو فطری ارتقاء کا نتیجہ قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں بینکاری کا یہ ارتقاء بھی ایک رضا کارانہ فطری عمل کا نتیجہ تھا۔ یعنی نظام بینکاری بحیثیت مجموعی جس خطرے سے دوچار تھا اسے اس سے محفوظ رکھنے کے لیے چند اصول واصلاحات کا فریم ورک وضع کر کے کرنا فذ کرنا ضروری تھا اور ظاہر ہے یہ کام ریاستی جبر کے تحت ہی ممکن تھا۔ ان کے نزدیک مرکزی بینکنگ اسی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے سامنے آئی، یعنی جس طرح دیگر سرمایہ دارانہ حکومتی ادارے مارکیٹ کو کنٹرول کرنے کے لیے حکمت عملی وضع کرتے ہیں اسی طرح مرکزی بینک کا کام نجی بینکوں کی کارگزاری کو کنٹرول کرنے کے لیے زری پالیسی بنانا ہوتا ہے۔ مگر تاریخی شواہد اس 'ارتقائی تعبیر' کا ساتھ نہیں دیتے۔ دیگر معیشت دانوں کے مطابق (۱۹) یورپ میں مرکزی بینک کی صورت اس وقت پیدا ہوئی جب قوم پرستانہ سرمایہ دارانہ ریاستوں کے بادشاہوں کو اپنی طویل جنگی مہمات کے اخراجات پورا کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ان بھاری اخراجات کو پورا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہوسکتا تھا کہ عوام الناس پر بھاری ٹیکس عائد کردیئے جائیں، مگر جنگی حالات کی ماری ہوئی عوام ان ٹیکسوں کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھی۔ ان حالات میں بادشاہوں کو یہ ترکیب سوجھی کہ بڑے بڑے بینکوں کی نجی تحویل میں لیکر انہیں مرکزی بینک کا درجہ دے دیا جائے اور بینکوں کی رسیدوں کو سرکاری نوٹوں میں تبدیل کر کے نوٹ چھاپ چھاپ کر اپنے اخراجات پورے کرنا شروع کردیئے

جائیں۔ گویا اس موقع پر جھوٹ اور فریب پر مبنی نظام بینکاری کو قانونی سند عطا کر دی گئی اور پہلے جو بد معاشی وظلم نجی سطح پر عام بینکار کیا کرتے تھے اب اسے ریاستی پشت پناہی فراہم کر دی گئی۔ ابتداً ان نوٹوں کی پشت پر سونے کی ایک مخصوص مقدار رکھنا ضروری سمجھی جاتی تھی مگر گردش زمانہ اور حالات کی تبدیلی کے تحت اس خانہ پوری سے جان چھڑالی گئی اور اب جس چیز کو 'سرکاری نوٹ' کہا جاتا ہے وہ محض 'زر قانونی' کی حیثیت رکھتا ہے جسکے پس پشت کسی قسم کا کوئی اثاثہ موجود نہیں ہوتا بلکہ یہ محض ایک 'قرض کی رسید' ہے جو مرکزی بینک حکومت کو اپنے اخراجات وغیرہ پورا کرنے کے لیے جاری کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید ماہرین معاشیات موجودہ مالیاتی نظام پر مبنی اکانومی کو نہیں مانتے بلکہ وہ اس کا تجزیہ (Credit economy) کے تحت کرتے ہیں۔ Barter اکانومی وہ ہوتی ہے جہاں اشیاء کی لین دین مساوی قدر کی اشاء سے ہوتی ہو اور اس کے لیے ضروری ہے کہ جس شے کو بطور آلہ مبادلہ یا زر استعمال کیا جائے وہ 'حقیقی قدر' (نہ کہ قانونی قدر یا Token value) کی متحمل ہو جیسے کہ سونا یا چاندی وغیرہ۔

نظام بینکاری کے ارتقا سے متعلق یہ تفصیلات جاننے کے بعد اس حوالے سے مولانا تقی عثمانی صاحب کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''لوگ اپنا سونا بطور امانت صرافوں کے پاس رکھ دیتے تھے اور سنار رسید لکھ دیتے تھے، پھر رفتہ رفتہ ان رسیدوں سے ہی معاملات شروع ہو گئے۔ لوگ اپنا سونا واپس لینے کم آتے تھے تو یہ صورتحال دیکھ کر صرافوں نے سونا قرض دینا شروع کر دیا۔ پھر جب یہ دیکھا کہ لوگ عموماً رسیدوں سے ہی معاملات کرتے ہیں تو صرافوں نے بھی قرض خواہوں کو سونے کے بجائے رسیدیں دینا شروع کر دیں۔ اس طرح بینک کی صورت پیدا ہوئی۔'' (ص:۱۱۵)

ہوسکتا ہے مولانا نے یہ مختصر انداز بیان محض 'سمندر کو کوزے میں بند کرنے' کی خاطر اپنایا ہو، مگر اس تحریر کو پڑھنے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مولانا بینکاری نظام کو کسی قسم کے جھوٹ، فریب اور دھوکہ دھی پر مبنی نہیں سمجھتے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس 'جھوٹ اور فریب' کا 'اسلامی متبادل' ممکن سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر (اور ضمیمے میں) واضح کیا گیا کہ موجودہ نظام بینکاری درحقیقت اسی جھوٹ اور فریب پر مبنی ہے جو پچھلے دور کے صراف عوام الناس کو دیا کرتے تھے، فرق صرف یہ ہے کہ پہلے اسے دھوکہ سمجھا جاتا تھا اور اب قانون کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ مگر یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ کسی باطل عمل کو قانونی سند عطا کر دینے سے وہ 'حق' نہیں بن جاتا۔ اگر آج تمام لوگ اپنے ڈپازٹس میں جمع شدہ رقوم کی وصولی کے لیے بینکوں کا دروازہ کھٹکھٹانے لگیں تو بینکوں کا جھوٹ اور فریب روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا۔

اسلامی بینکنگ کے امکانات کا جائزہ:۔

بینکنگ کے درست تصور کو سمجھ لینے کے بعد اب ہم اس کی اسلامیت کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بحث کو ہم درج ذیل امور پر تقسیم کرتے ہیں۔

بینکنگ کی شرعی حیثیت:۔

جیسا کہ ابتدائے مضمون میں ذکر کیا گیا تھا کہ بینکنگ کی اسلام کاری ممکن ہونے کا دعوی دو شرائط کی تکمیل پر منحصر ہے۔ اول fractional reserve banking کا شرعاً جائز ہونا، دوئم نظام بینکاری کو سود کے بجائے بیع میں تبدیل کر لینا۔ مجوزین بینکاری نظام کا غلط تصور قائم کرنے کی وجہ سے صرف 'غیر سودی بینکاری' کے امکانات کی ثانوی بحث الجھتے رہتے ہیں، گویا ان کے نزدیک بینکنگ کی واحد خرابی اس کا 'سود' استعمال کرنا ہے، اور جواز بینکاری کی ساری بحث کو وہ اسی ایک مسئلے پر مرتکز کر دیتے ہیں۔ اس ناقص فہم کے باعث وہ fractional reserve banking کی پوری بحث پس پشت ڈال دیتے ہیں، جبکہ بینکنگ کی اسلام کاری ممکن ہونے کی بحث میں بینک کا سودی یا غیر سودی ہونا ثانوی مسئلہ ہے بنیادی بحث یہ ہے کہ بینک جو زر تخلیق کرتا ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل درج بالا گفتگو سے اخذ ہونے والے تین اہم مقدمات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے:

۱۔ جب تک اکانومی میں ایک ایسا ایجنٹ موجود رہے گا جو بیک وقت لوگوں سے رقم (deposit) وصول بھی کرے اور ادھار (financing) بھی دے اس وقت تک 'فرضی زر کی تخلیق' کا عمل جاری رہے گا اور یہ بحث (یا ادارہ) لازماً (جعلی) 'قرض کی رسید' (promise of payment) کو آلہ مبادلہ (means of payment) کی حیثیت دے کر اصل زر کے خاتمے کا باعث بنے گا۔ ظاہر ہے اگر بینک ڈپازٹس جو (promise of payment) کی رسید ہوتے ہیں کو بطور آلہ مبادلہ استعمال کرنے کی اجازت نہ ہو تو اس صورت میں بینک کی قرض دینے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی اور وہ محض ایک ایسے ادارے کی حیثیت اختیار کر لے گا جہاں لوگ اپنی امانت حفاظتی نقطہ نگاہ سے جمع کراتے ہوں۔ مگر ایسے کسی ادارے کو کسی بھی تعریف (یہاں تک کہ مجوزین کی تعریف) کی رو سے بینک نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ ثمن حقیقی پر مبنی مالیاتی نظام میں 'بیت المال' وغیرہ تو ہو سکتے ہیں، مگر بینک نہیں ہو سکتے۔

۲۔ لہٰذا بینکنگ 'صرف اور صرف' ایک ایسے مالیاتی نظام ہی میں ممکن ہے جہاں ثمن حقیقی یا اصل زر کے بجائے قرض پر مبنی زر (promise of payment) بطور آلہ مبادلہ (means of payment) استعمال ہو اور ایک ایسا مالیاتی نظام جہاں ثمن حقیقی یا اصل زر بطور قانون رائج ہو وہاں بینک کا وجود کالعدم ہو جائے گا۔ یعنی وجود بینکنگ کے لیے لازم ہے کہ قرض لوگوں کا ذاتی معاملہ نہ رہے بلکہ اسے بطور آلہ مبادلہ استعمال کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ اکانومی میں ایک شخص قرض دینے اور ڈپازٹس وصول کرنے کا کام بھی کر رہا ہو مگر قرض کی رسید بطور آلہ مبادلہ استعمال نہ ہو رہی ہو۔

۳۔ یہی وجہ ہے کہ بینکنگ کو شرکت و مضاربت کے اصولوں پر چلانا ممکن ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شرکت و مضاربت کے معاہدات میں تخلیق زر کی صورت قطعاً پیدا نہیں ہوتی، کیونکہ یہ 'نجی معاہدات' ہوتے ہیں نہ کہ آلہ مبادلہ کے طور پر استعمال ہونے والے مالی دعوے۔ شرکت و مضاربت کے اصولوں پر بینکاری ممکن ہونے کا وہم صرف انہی حضرات کو ہو سکتا ہے جو بینک کو غلط طور پر زری ثالث سمجھ بیٹھے ہوں۔

ان بنیادی مقدمات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد نظام بینکاری کی شرعی حیثیت سمجھ لینا بالکل آسان ہو جاتا ہے اس گفتگو کے دو تناظر ممکن ہیں۔ایک یہ کہ بینک ڈپازٹس کی شکل میں جو زر تخلیق کرتا ہے، وہ ' جعلی قرض کی رسید' ہوتا ہے۔ دوئم یہ زر کسی حقیقی اثاثے کی بنیاد پر قائم شدہ قرض ہوتا ہے ۔(یہ دوسری صورت محض بحث کے لیے فرض کی گئی ہے، کیونکہ(fractional reserve banking) میں یہ بہر حال امر محال ہے۔

بینک زر بطور حقیقی قرض کی رسید: قرض کی رسید کو بطور آلہ مبادلہ استعمال کرنے کا عدم جواز علماء کرام کیلئے کوئی نئی بحث نہیں اور اس کے دلائل ذکر کرنا تحصیل حاصل کے زمرے میں شمار ہو گا لہذا خوف طوالت کی بنا پر اس سے سہو نظر کرتے ہیں، اس ضمن میں موطا امام مالکؒ میں یحیی سے روایت شدہ درج ذیل واقعہ راہنمائی کیلئے کافی ہے:

☆ مروان بن حکم کے دور میں جب مرکز سے رقم (درہم و دینار) پہنچنے میں تاخیر ہوئی تو صوبے کے گورنر نے لوگوں کو بازار کی اشیاء خریدنے کیلئے رسیدیں جاری کر دیں جنہیں لوگوں نے خریدنا اور بیچنا شروع کر دیا۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے مروان سے کہا کہ کیا تم سود کو حلال کر رہے ہو؟ مروان نے کہا کہ میں اس چیز سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں؟ آپؓ نے فرمایا کہ پھر یہ رسیدیں کیا ہیں جنہیں لوگ خرید اور بیچ رہے ہیں؟ اس کے بعد مروان نے وہ رسیدیں لوگوں سے واپس لے لیں۔ اس روایت میں اہم بات یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے ان رسیدوں(promise of payment) کے استعمال کو سود کہا جنہیں لوگ اشیا کی خرید و فروخت کیلئے استعمال کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ قرض کی رسید (دین) کو بطور آلہ مبادلہ استعمال کرنا شرعاً ناجائز ہے، یعنی قرض (دین) جس مال (عین) کی رسید ہو مبادلے سے قبل اس مال پر قبضہ کئے بغیر رسیدوں ہی کو بطور آلہ مبادلہ استعمال کرنا درست نہیں۔ اسی اصول کو یوں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ قرض کی خرید و فروخت ناجائز ہے۔ شرع قرض کو ایک نجی معاہدے کی حیثیت دیتی ہے اور معاہدے کو نجی حیثیت سے نکال کر بطور آلہ مبادلہ استعمال کرنا درست نہیں اور بینکاری (بشمول اسلامی بینکاری) در حقیقت اسی عمل کی آفاقیت کا دوسرا نام ہے۔

بینک زر بطور جعلی قرض کی رسید: اس صورت پر درج بالا کے علاوہ دو مزید اشکالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ کیا شرعاً ایسا وعدہ کرنا جائز ہے جسے پورا کرنا عملاً ناممکن ہو اور وعدہ کرنے والا اس حقیقت سے واقف بھی ہو؟ اگر یہ جائز ہے تو کیا صرافوں کا ایسا کرنا بھی جائز تھا؟ اس سلسلے میں مجوزین کے نظریہ زر کے مطابق دوسری اہم بات یہ ہے کہ بینک کا زر در حقیقت افراط زر کا باعث بھی بنتا ہے جس کے نتیجے میں لوگوں کی قوت خرید اور اثاثوں کی مالیت میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور اس کا اثر ہر خاص و عام پر بلکہ غریب عوام پر زیادہ پڑتا ہے ۔ یوں قوت خرید زر استعمال کرنے والے ایجنٹ سے زر تخلیق کرنے والوں (حکومت و بینک) کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طریقے سے لوگوں کی مال و دولت ہتھیا لینا شرعاً جائز ہے؟ قرآن مجید میں ارشاد ہوا: لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (نساء ۲۹)

' آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ بلکہ باہمی رضامندی سے لین دین ہونا چاہیے' ظاہر ہے

فرضی زر تخلیق کر کے لوگوں کے مال ہتھیا لینے کا شمار تجارت میں نہیں ہو سکتا پس اس طرح مال کھانا 'باطل' طریقوں سے لوگوں کے مال کھانے کے زمرے میں شامل ہوگا۔

۲۔آخر اس بات کی کیا شرعی و عقلی دلیل ہے کہ ایک ایجنٹ (بینک یا حکومت) کو تخلیق زر کی کھلی اجارہ داری دے دی جائے اور وہ محض زر تخلیق کر کے رقم بناتا پھرے؟ ظاہر ہے بینک زر تخلیق کرتا ہے ایک طرف وہ اسے قرض پر دیکر نفع کماتا ہے تو دوسری طرف ان (جعلی) قرضوں کو بطور اثاثہ بنا کر ان کا مالک بن بیٹھتا ہے۔ اگر ایسا کرنا ٹھیک ہے تو سب لوگوں کو اس چیز کی قانونی اجازت ملنی چاہئے کہ وہ اپنے اپنے نوٹ چھاپ کر (یا سرکاری نوٹوں کی فوٹو کاپیاں بنا کر) استعمال کریں۔

دفاع بینکاری کے لایعنی عذر:۔

جب بینکنگ کے درست تصور کی حقیقت واضح کردی جائے تو مجوزین بے سروپا تاویلوں اور عذروں کی بنیاد پر اس کا جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں چند ایک کا ذیل میں مختصر تجزیہ کیا جاتا ہے :

☆ تمام لوگ کبھی بینک سے اصل زر نکلوانے نہیں آتے، لہذا بینکنگ درست ہوئی: اس عذر کا اصل بحث سے کچھ لینا دینا ہی نہیں، دھوکہ آخر دھوکہ ہے چاہے کوئی اس کی شکایت کرے یا نہ کرے۔ اگر کوئی شخص مہارت کے ساتھ لوگوں کی جیب کاٹتا ہے اور کسی کو معلوم نہ ہو نیز کوئی اس کے خلاف مقدمہ بھی درج نہ کرائے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اس طرح چوری کرنا درست عمل ہے؟

☆ بینک یہ سب حکومت کی اجازت سے کرتا ہے: یہ عذر بھی غیر متعلق ہے کیونکہ حکومت کا کسی فعل کو جائز کہہ دینا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ شرعاً بھی جائز ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یورپ میں شراب کی خرید و فروخت اور زنا حکومت اور قانون کی اجازت سے کیے جاتے ہے تو کیا یہ سب بھی جائز ہونگے؟ اسی طرح مسلم ممالک میں سودی لین دین بھی حکومت کی اجازت ہی سے ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حکومت کو شریعت کی پابندی کرنا ہے نہ کہ شرع کو حکومت کی

☆ سو فیصد reserve بینکنگ کے ساتھ بینکاری جائز ہوگی: یہ کہنے والے حضرات درحقیقت بینکاری کو سمجھے نہیں، اوپر یہ واضح کیا گیا کہ جب تک اکانومی میں ایک ایسا ایجنٹ موجود رہتا ہے جو بیک وقت رقوم وصول کرنے اور قرض دینے کا کام کرتا ہے اس وقت تک فرضی زر کی تخلیق کا عمل جاری رہے گا۔ یہ عمل صرف اس وقت ختم ہوگا جب اصل زر کے علاوہ اور کوئی شے بطور آلہ مبادلہ استعمال نہ کی جائے۔ ظاہر ہے اگر بینک سو فیصد reserve بینکنگ کے اصول پر کام کرنے لگیں تو وہ سرے سے بینک رہیں گے ہی نہیں کیونکہ اس صورت میں ان کی قرض دینے کی صلاحیت سلب ہو جائے گی۔ پھر فرض کریں اگر اس اصول کے مطابق بینکاری کی بھی جانے لگے تو یقین مانئے صفحہ ہستی سے ختم ہونے والا سب سے پہلا کاروبار بینکاری ہی ہوگا کیونکہ اس صورت میں یہ ہرگز بھی نفع بخش نہ رہے گا۔ بینکوں کی آسمان سے باتیں کرتی عمارتیں، خوبصورت فرنیچر، ان کے ملازمین کی لاکھوں روپے کی تنخواہیں وغیرہ

درحقیقت وہ ثمرات ہیں جن کا حصول سو فیصد reserve بینکنگ میں ممکن نہیں رہتا۔ آخری بات یہ کہ فی الوقت دنیا میں اس اصول کے مطابق بینکاری بشمول اسلامی بینکاری) کی ہی کہاں جارہی ہے کہ ہم اس فرضی اور غیر موجود امکان کو بنیاد بنا کر حاضر و موجود کو جائز ٹھہرانے کی کوشش کریں؟

☆ بینک زر کا استعمال عموم بلوی کی بنا پر ناگزیر ضرورت بن چکا ہے: مجوزین کا یہ ایک عمومی حربہ ہے کہ اولاً وہ اپنے حق میں اصولی جواز اور دلائل پیش کرتے ہیں مگر جب ان کے تمام دلائل کو علمی طور پر رد کر دیا جائے تو پھر ضرورت کی دہائی دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اسلامی بینکاری کے حق میں نظریہ ضرورت کا تجزیہ راقم نے اپنے مضمون 'سودی بینکاری کے فلسفہ متبادل کا جائزہ' میں تفصیل سے پیش کیا ہے، قارئین اسے وہاں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔ فرض کریں یہ مان لیا کہ بینک زر ایک ایسی برائی ہے جو عام ہو چکی ہے، مگر اس کے بعد سوال یہ ہے کہ اسلامی بینکاری کے نام پر برائی کے فروغ میں حصے دار بن جانا کہاں کی عقل مندی ہے؟ درحقیقت ضرورت کے تحت حرام کو حلال کرنے کا مقصد ایسے ماحول کو ختم کر دینا ہوتا ہے جو حرام کو ضرورت بناتا ہے نہ یہ کہ اس ماحول کو ہمیشہ کیلئے قائم و دائم رکھنا۔ دوسری بات یہ کہ کسی حرام فعل کا عام ہو جانا اسکے حلال ہو جانے کی دلیل نہیں بن جاتی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر سب سے پہلے تو سود ہی کو حلال ہو جانا چاہئے کہ موجودہ دور میں اس سے زیادہ عام اور کوئی دوسری وبا نہیں۔

☆ جزوی اصلاح کی کوشش میں خرابی کیا ہے؟ درج بالا بحث کے بعد اسلامی بینکاری کے حق میں ایک عذر یہ بھی پیش کر دیا جاتا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ موجودہ نظام باطل مگر غالب نظام ہے، نیز فی الحال ہمارے پاس اتنی قوت نہیں کہ ہم اسے تہس نہس کرسکیں۔ لہذا اگر پورے شر سے بچنے کیلئے موجود نظام کی جتنی اصلاح فی الحال ممکن ہو وہ کر لی جائے تو اس میں کیا خرابی ہے؟ ظاہر ہے بڑے شر کے مقابلے میں چھوٹے شر کو اپنانا شرع کا بھی حکم ہے اور عقل کا تقاضا بھی۔ اصولی طور پر دعوی درست ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس حکمت عملی کے تحت جس شے کو اپنایا جارہا ہے اسے 'شر' سمجھ کر احساس گناہ کے ساتھ ہی اختیار کیا جائے، اس پر اسلامی کا لیبل چسپاں کر کے نہ تو اسلام کو بدنام کیا جائے اور نہ ہی آنے والی نسلوں کو 'شر' پر راضی رہنے کا جواز فراہم کیا جائے۔ موجود نظام کی کسی ادارتی تنظیم کی اصلاح کر کے اسے اسلامی قرار دینے کے لیے دو شرائط کا پورا ہونا لازم ہے:

(۱)۔ تبدیلی کے بعد اس شے کا قواعد شریعہ کے مطابق ہونا ممکن ہو اور واقعتاً وہ ایسی ہو بھی جائے۔

(۲)۔ تبدیلی کے بعد وہ شے مقاصد الشریعہ کے حصول کا ذریعہ بھی بن جائے۔

اگر ماہرین اسلامی بینکاری یہ ثابت کریں کہ اسلامی بینکاری ان دونوں شرائط پر پوری اترتی ہے تو فبہا ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مگر اصل مسئلہ یہی ہے کہ اولاً نہ تو قواعد شریعہ کے مطابق بینکاری ممکن ہے اور جو شے عملاً 'اسلامی بینکاری' کے نام پر موجود ہے وہ بھی قواعد شریعہ کے مطابق نہیں دوئم موجود اسلامی بینکاری مقاصد الشریعہ کے بجائے سرمایہ دارانہ مقاصد کے حصول میں مصروف عمل ہے۔ جب اسلامی بینکاری کے معاملے میں یہ دونوں شرائط ہی مفقود ہیں تو پھر اسے 'اسلامی' کہنے کا جواز ہی کیا ہے؟ اگر مجوزین یہ مان لیں کہ اسلامی بینکاری اصولاً ناجائز بینکاری ہے تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں رہے گا کیونکہ اصل مسئلہ یہی ہے کہ ماہرین اسلامی معاشیات اسلام

کے نام پر ایک غیر اسلامی شے کو کیوں فروغ دے رہے ہیں؟ بلکہ اسلامی بینکاری کو ضرورت کا شاخسانہ کہنے کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس کا نام اسلامی بینکاری کے بجائے 'حرام بینکاری' رکھا جائے تا کہ لوگ اسے بطور ایک برائی سمجھ کر کم سے کم استفادہ کریں نیز ان میں اس سے بچنے کا جذبہ بھی بیدار ہو۔

متبادل کیا ہے؟

یہ سوال کہ اگر بینکاری نہ کریں تو کیا کریں تو اسکا اصولی جواب یہ ہے کہ ہماری جدوجہد کے دو بنیادی مقاصد ہونے چاہئیں:

☆ اولاً سرمایہ داری اور اسکے تمام مظاہر اداروں (خصوصاً کارپوریشن، بینک اور اسٹاک ایکسچینج) سے گلوخلاصی حاصل کرنا۔

☆ ثانیاً زرحقیقی (سونے چاندی) پرمبنی مالیاتی نظام کا احیا۔

ایسی ہر جدوجہد جو سرمایہ دارانہ ریاستی وادارتی صف بندی' کے اندر' رہتے ہوئے اسلامی اصلاح کو مطمع نظر بنائے گی وہ بالآخر سرمایہ داری ہی کی تصویب کا باعث بنے گی۔ یہ مسئلہ کہ درج بالا مقاصد کے حصول کو ممکن بنانے والی جدوجہد کیسے مرتب کی جاسکتی ہے تو یہ الگ موضوع ہے جس کی تفصیلات بیان کرنا یہاں ممکن نہیں، اس نوع کی جدوجہد اور اس کے خدوخال جاننے کیلئے نوٹ نمبر ۲۶ میں جن کتب کا حوالہ دیا گیا ہے انکا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

نتائج:۔

مضمون کا اختتام ہم چند اصولی کلمات پر کرتے ہیں:۔

۱۔ مجوزین جس نظریہ بینکنگ کی بنیاد پر اس کی اسلام کاری ممکن سمجھتے ہیں، وہ نظریہ ہی سرے سے غلط ہے۔ دوسرے لفظوں میں جواز اور امکان اسلامی بینکاری کی کل عمارت غلط نظریات پر قائم ہے۔

۲۔ جس چیز کو بینکاری کہتے ہیں اس کی اسلام کاری کا کوئی امکان موجود نہیں کیونکہ بینکاری کی اسلام کاری ثابت کرنے کیلئے یہ ماننا لازم ہے کہ شرعاً قرض کو بطور آلہ مبادلہ استعمال کرنا جائز ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ شرعاً جھوٹا وعدہ کرنا اور جعلی قرض کی رسیدیں چلانا بھی جائز ہے۔ ظاہر ہے یہ تمام مفروضات باطل ہیں۔

۳۔ شرکت و مضاربت کے اصولوں کے مطابق تمویل درست ہوسکتی ہے بشرطیکہ یہ معاہدات دو افراد کا نجی معاملہ رہیں۔ ثمن حقیقی پر مبنی مالیاتی نظام میں بینک کو شرکت و مضاربت کے اصولوں پر چلانا ممکن نہیں۔ درحقیقت درست اسلامی تمویل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے مدارس اور اسلامی تحریکات کے تحت منظم نہ کیا جائے۔ نفع خوری کو بڑھاوا دینے کے لیے قائم کردہ نجی تمویلی نظام سرمایہ داری ہی کی تقویت کا باعث بنے گا نہ کہ احیائے اسلام کا۔

اگر اہل علم حضرات مضمون کے تجزیئے میں کوئی سقم اور غلطی محسوس کریں تو اس پر مطلع کر کے ہماری راہنمائی فرمائیں۔

وما علینا الا البلاغ

ضمیمہ بابت 'اسلامی بینکاری: غلط سوال کا غلط جواب'

اس ضمیمے میں ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ موجودہ بینکاری نظام fractional reserve banking کے جس اصول کے تحت چلتا ہے، وہ کیسے کام کرتا ہے۔ تفہیم مباحث کیلئے اپنی گفتگو کو ہم چند سطحوں پر تقسیم کئے دیتے ہیں۔

پہلی سطح:۔ایک ایسی اکانومی کا تصور کیجئے جہاں کسی قسم کا کوئی بینک موجود نہیں اور تخلیق زر کا واحد ذریعہ صرف حکومت کا مرکزی بینک ہے ۔فرض کریں مرکزی بینک 1000 روپے کے نوٹ چھاپ دیتا ہے (یہ نوٹ وہ کس چیز کے عوض چھاپتا ہے یہاں ہم اس بحث سے اغماز کرتے ہیں) اور حکومت یہ اعلان کردیتی ہے کہ آج کے بعد قرضوں کی ادائیگی صرف ان نوٹوں کی صورت میں ہی تسلیم کی جائے گی۔ مرکزی بینک کی بیلنس شیٹ کچھ اس طرح دکھائی دے گی:

مرکزی بینک کی بیلنس شیٹ			
اثاثے		واجب الادا ادائیگیاں	
قرض	1000	کرنسی	1000

اس صورت حال میں چونکہ سارا کا سارا زر کرنسی کی صورت میں موجود ہے لہذا زر کی رسد برابر ہوگی کل کرنسی کی رسد کے یعنی

زر کی رسد = کرنسی نوٹ

دوسری سطح:۔فرض کریں کہ ایسے کمرشل ادارے یا بینک قائم ہوتے ہیں جو قرض نہیں دیتے بلکہ ان کا مقصد محض لوگوں کی بچتوں وغیرہ کی حفاظت کرنا ہے۔ بحث کو آسان کرنے کیلئے فرض کریں کہ لوگ سارے سرکاری نوٹ ان بینکوں میں جمع کرا دیتے ہیں اور خرید و فروخت کیلئے بینکوں کی رسیدیں استعمال کرنے لگتے ہیں (ارتقاء بینکنگ میں صرافوں کا دوسرا دور)۔اس مثال میں چونکہ بینکوں نے تمام ڈپازٹس اپنے پاس بطور reserves رکھے ہیں لہذا اس بینکاری نظام کو 100% reserves banking (سو فیصد reserves بینکنگ) کہتے ہیں۔کمرشل بینکوں کی بیلنس شیٹ کچھ یوں ہوگی:

کمرشل بینکوں کی بیلنس شیٹ

اثاثے		واجب الادا ادائیگیاں	
Reserves(Cash)	1000	ڈپازٹس	1000

اب چونکہ سارا کا سارا زر ڈپازٹس کی صورت میں استعمال ہو رہا ہے لہذا زر کی رسد برابر ہوگی بینکوں کے کل ڈپازٹس کے، یعنی

زر کی رسد = بینک ڈپازٹس

تیسری سطح: درج بالا دو سطحیں محض تفہیم کیلئے بیان کی گئیں تھیں کیونکہ حقیقتاً کوئی بھی بینک سو فیصد reserve بینکنگ کے اصول پر

کام نہیں کرتا (اور نہ ہی کر سکتا ہے)۔ اب فرض کریں کہ بینک اپنے ڈپازٹس کا ایک حصہ (مثلاً 20%) اپنے پاس بطور reserves رکھ کر بقیہ رقم قرض کے طور پر چلاتے ہیں۔ کیونکہ اب بینک اپنے ڈپازٹس کا محض ایک حصہ اپنے پاس رکھتے ہیں لہٰذا اس نظام بینکاری کو fractional reserve banking (سو فیصد سے کم reserve بینکاری) کہتے ہیں۔ بینک کل ڈپازٹس کے جتنے فیصدی حصے کو بطور reserves رکھتے ہیں اسے reserve requirement (rr) یا reserve ratio کہا جاتا ہے (ہماری مثال میں rr بیس فیصد ہے) reserve ratio کتنا ہونا چاہئے اس کا فیصلہ عموماً مرکزی بینک کرتا ہے۔ ان reserves کو اپنے پاس رکھنے کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگ اپنی روزمرہ ضروریات کی تکمیل کیلئے کرنسی نوٹ بینکوں سے نکلواتے رہتے ہیں (وہ اور بات ہے کہ یہ نوٹ بالآخر گھوم کر پھر بینکوں کے پاس ہی آجاتے ہیں، کسی مخصوص وقت میں کرنسی نوٹوں کا ایک محدود حصہ ہی نظام بینکاری سے باہر لوگوں کے پاس موجود ہوتا ہے)۔ بینکوں کے پاس زیادہ reserves بچ رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ انہیں خاطر خواہ مقدار میں قرض کے قابل بھروسہ طلب گار نہیں مل پاتے۔ الغرض اس نظام میں ڈپازٹس کے دو حصے ہو جاتے ہیں، ایک وہ جو reserves کی شکل میں رکھ لیا جاتا ہے اور دوسرا وہ جو قرض کی صورت میں دے دیا گیا، بینک موخر الذکر پر سود کماتا ہے جبکہ اول الذکر پر وہ کچھ نہیں کماتا۔

اس اصول بینکاری کو سمجھنے کیلئے فرض کریں کہ اکانومی میں بہت سے بینک ہیں اور ابتداً سو روپے کے ڈپازٹس بینک الف میں جمع کرائے گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب 1000 روپے کے ڈپازٹس کا بیس فیصد یعنی 200 روپے بطور reserve بینک الف کے پاس محفوظ ہونگے جبکہ بقیہ 800 روپے وہ زید کو قرض پر دے دیتا ہے (عملاً بینک کچھ رقم ذاتی سرمایہ کاری کیلئے بھی استعمال کرتا ہے مگر یہاں ہم اس سے سہو نظر کرتے ہیں کیونکہ اس کا تخلیقِ زر کے عمل سے کوئی تعلق نہیں)۔ اب بینک الف کی بیلنس شیٹ کچھ یوں ہوگی:

بینک الف کی بیلنس شیٹ

اثاثے		واجب الادا ادائیگیاں	
Reserves	200	ڈپازٹس	1000
قرضے	800		

بینک عموماً قرض نوٹوں وغیرہ کی صورت میں نہیں دیتے بلکہ اس کا طریقہ صرف یہ ہوتا ہے کہ زید کا ایک اکاؤنٹ کھول کر اسے چیک بک جاری کردی جاتی ہے اور یوں قوت خرید زید کو منتقل ہو جاتی ہے۔ مگر فرض کریں کہ بینک الف زید کو نوٹوں کی صورت میں قرض دیتا ہے۔ چونکہ اس سطح تک ہم نے یہ فرض کیا ہے کہ لوگ نوٹوں کے بجائے صرف بینکوں کی رسیدیں ہی بطور کرنسی استعمال کرتے ہیں تو زید یا تو اس رقم کو بینک الف میں اپنا اکاؤنٹ کھول کر جمع کروادے گا اور یا پھر کسی دوسرے بینک (مثلاً بنک ب) میں جمع کروائے گا۔ فرض کریں یہ رقم وہ بینک ب میں جمع کرواتا ہے۔ چونکہ بینک ب میں بھی اپنے ڈپازٹس کا محض بیس فیصد ہی اپنے پاس reserves کی صورت میں

رکھتا ہے، لہذا وہ 800 روپے میں سے 160 روپے اپنے پاس رکھے گا جبکہ بقیہ 640 روپے بطور قرض آگے بڑھا دے گا۔ بینک ب کی بیلنس شیٹ کچھ اس اس طرح دکھائی دے گی:

بینک ب کی بیلنس شیٹ

اثاثے		واجب الاداادائیگیاں	
Reserves	160	ڈپازٹس	800
قرضے	640		

نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ اب دونوں بینکوں کے کل ڈپازٹس ملا کر 1800 روپے ہو گئے یعنی اب زر کی کل مقدار 1800 روپے ہو گئی کیونکہ اب بینکوں کی 1800 روپے مالیت کی رسیدیں یا چیک بطور زر استعمال ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے قرض دینے کا یہ عمل ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ اگر بینک ب نے 640 روپے کا یہ قرض ناصر کو دیا ہے تو ناصر اسے اسی بینک میں یا بینک ج میں کروا دے گا۔ بینک ج بھی اس رقم 640 روپے کا بیس فیصد اپنے پاس رکھ کر بقیہ ادھار پر چلا دے گا جسکے نتیجے میں بینک ج کی بیلنس شیٹ ذیل ہوگی:

اب مجموعی ڈپازٹس یعنی زر کی کل رسد بڑھ کر 2,440 روپے ہو گئی۔ یہ عمل ج سے آگے چلتا رہے گا۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہر چکر میں قرضوں سے تخلیق ہونے والے ڈپازٹس کم ہوتے چلے جا رہے ہیں لہذا یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ عمل کسی مقام پر جا کر ضرور ختم ہو جائیگا۔ یہ سوال کہ اس عمل کے اختتام پر کل ڈپازٹس کتنے ہوں گے تو اسے درج ذیل فارمولے سے اخذ کیا جا سکتا ہے:

زر کی کل رسد = $(1/rr) \times$ اول ڈپازٹس

ہماری مثال میں rr بیس فیصد جبکہ اول ڈپازٹس 1,000 روپے فرض کئے گئے تھے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بینک 1,000 روپے ڈپازٹس سے مجموعی طور پر 5,000 روپے کے ڈپازٹس تخلیق کر دے گا: ان پانچ ہزار کے ڈپازٹس میں سے ایک ہزار کی پشت پر تو مرکزی بینک کے اصل نوٹ (جنہیں اصل ڈپازٹس کہا گیا ہے) ہونگے جبکہ دیگر چار ہزار قرض کی صورت میں تخلیق ہوئے۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کی لینی چاہئے کہ نئے بینک ڈپازٹس درحقیقت قرضوں سے جنم لے رہے ہیں۔ تمام بینکوں کی مجموعی بیلنس شیٹ کچھ اس طرح دکھائی دے گی:

تمام بینکوں کی مجموعی بیلنس شیٹ

اثاثے		واجب الاداادائیگیاں	
Reserves	1000	ڈپازٹس	5000
قرضے	4000		

دھیان رہے کہ نظام بینکاری چار ہزار کے یہ قرض ان معنی میں بلاکسی عوض تخلیق کرتے ہیں کہ انہیں ادا کرنے کیلئے ان کے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ زر کی یہ مقدار محض کمپیوٹر کی یادداشت میں محفوظ ہوتی ہے۔ڈپازٹس تخلیق کرتے وقت اصولاً بینک یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ان تمام ڈپازٹس کے مالکان جب چاہیں اپنے ڈپازٹس کو حکومتی نوٹوں میں تبدیل کرواسکتے ہیں مگر حقیقتاً یہ ایک ناممکن الوفا وعدہ ہوتا ہے۔اگر تمام لوگ ایک ہی وقت میں بینکوں سے اپنے ڈپازٹس طلب کرلیں تو بینک دیوالیہ ہوجائیں گے کیونکہ ان کے پاس ڈپازٹس کے مساوی رقم کبھی موجود ہی نہیں ہوتی۔جب کبھی ایسے حالات پیش آئیں کہ لوگ بینکوں کے پاس موجود reserves سے زائد رقم طلب کرنے لگیں تو ایسی صورت میں بینک مصیبت سے دوچار ہوجاتے ہیں اور اس موقع پر مرکزی بینک انہیں قرض فراہم کر کے ان کے reserves میں اضافہ کردیتا ہے (مرکزی بینک کے اس کردار کو lender of the last resort کہتے ہیں)۔یاد رہے کہ مرکزی بینک بھی یہ قرض بلاکسی عوض تخلیق کرتا ہے۔گویا جھوٹ اور فریب کے اس نظام کو بحران سے بچانے کے لیے ریاستی جبر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔کھاتے داروں کی ڈپازٹس سے زیادہ رقم طلب کرنے کی وجہ سے بینکوں کے مصیبت میں پھنس جانے کی ایک مثال سن ۱۹۸۵ میں شمال مشرقی امریکی ریاستوں کے بینکوں کا دیوالہ ہوجانا تھا۔اسی طرح ۲۰۰۱ میں ارجنٹائن کے بینکوں کی مثال بھی موجود ہے جہاں کھاتے داروں کو اپنے ڈپازٹس سے رقم نکلوانے اور بینک کے اندر داخل ہونے سے روکنے کے لیے باقاعدہ پولیس فورس کا استعمال کیا گیا۔بعض اوقات پورے بینکاری نظام کو دیوالیہ پن سے بچانے کے لیے کسی ایک بینک کو بند کرکے اس کی قربانی دے دی جاتی ہے۔اسی طرح ماضی قریب میں پاکستان میں جب بینک الفلاح سے متعلق افواہیں اڑنے لگیں تو لوگ بڑی تعداد میں اپنے ڈپازٹس بینک سے نکلوانے لگے اور بینک کی مالی ساخت بری طرح متاثر ہونے لگی۔اس موقع پر عوام میں بینک کی ساخت بحال کرنے کیلئے حکومت و مرکزی بینک کو مداخلت کرنا پڑی اور اعداد وشمار کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ بینک الفلاح ایک نہایت مضبوط اور قابل اعتبار بینک ہے۔الغرض بینکاری کا جو نظام بظاہر نہایت ہموار اور محفوظ طرز پر چلتا دکھائی دیتا ہے،اس کی وجہ اس کی پشت پر ریاستی جبر وذرائع کا موجود ہونا ہے۔

بینک زر کی یہ فرضی مقدار کیسے تخلیق کرتے ہیں اس کی وضاحت اصل مضمون میں کی گئی تھی کہ بینک جب کسی شخص کو قرض دیتا ہے تو وہ کسی ایک شخص کی قوت خرید کسی دوسرے فرد کو منتقل نہیں کرتا بلکہ نئے سرے سے نئی قوت خرید تخلیق کرتا ہے۔اس بحث سے یہ سمجھنا بھی آسان ہوجاتا ہے کہ آخر بینک کرنسی (cash) کے بجائے اپنے کارڈز (ATM, Debit and Credit cards) کو فروغ دینے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔بینکار (ابتداً صراف) خوب جانتے تھے (اور جانتے ہیں) کہ وہ عوام الناس کو محض دھوکہ دے کر جھوٹے وعدے کررہے ہیں لہذا وہ شعوری طور پر اس چیز کی کوشش کرتے کہ لوگ کرنسی (سونے چاندی یا نوٹوں) کے بجائے بینک کی رسیدیں و چیک بطور آلہ مبادلہ استعمال کریں اور لوگوں کی ترجیحات میں یہ تبدیلی لانے کے لیے کئی مارکیٹنگ ہتھکنڈے بطور ہتھیار استعمال کیے گئے (اور کیے جاتے ہیں)، مثلاً

☆ لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بینکوں کی برانچیں شہر کے اہم مقامات پر کھولی جاتیں اور ان برانچوں کو خوبصورت بنانے کے لیے ہر قسم کے سامان تعیش سے مزین کیا جاتا۔

☆ مختلف حیلوں بہانوں سے لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا کہ سونے اور نوٹ وغیرہ استعمال کرنا ٹھیک نہیں (مثلاً انہیں استعمال کرنا محفوظ نہیں وغیرہ)۔

☆ اشتہارات کے ذریعے لوگوں کو بینکوں کے فراہم کردہ کرنسی کے متبادل ذرائع (مثلاً کارڈز اور ٹریولرز چیک وغیرہ) استعمال کرنے کی ترغیب دینا۔

☆ ہر بڑے شاپنگ سینٹر وغیرہ کرنسی کی جگہ بذریعہ بینک کارڈ خریداری کی سہولت فراہم کرنا (یورپ وغیرہ میں اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ اگر آپ کے پاس بینک کارڈ کے بجائے سرکاری نوٹ ہیں تو آپ کے لیے خریداری کرنا مشکل ہو جائے گی کیونکہ ہر بڑا دوکاندار ارشاپنگ سینٹر کیش کے بجائے کارڈ کی صورت میں ادائیگی کو ترجیح دیتا ہے)۔

☆ حکومتی مدد سے بہت سی خرید وفروخت اور ادائیگیوں کیلئے کرنسی کے بجائے بینک زر کو قانوناً لازم قرار دینا۔

ان سب کا مقصد صرف یہ ہے کہ جھوٹ اور دھوکے پر مبنی بینکاری نظام کو محفوظ طریقے سے قابل عمل رکھا جاسکے اور بینکوں کو کم از کم اپنے پاس بطور reserves رکھنا پڑے کیونکہ اوپر دیئے گئے فارمولے میں دیکھا جاسکتا ہے کہ reserve ratio(rr) جتنا زیادہ ہوگا بینکوں کی قرض دینے کی صلاحیت اتنی ہی کم ہوگی۔ اگر reserve ratio صفر کر دیا جائے تو بینک لامحدود قرض دینے کی صلاحیت حاصل کرلیں گے یعنی لوگ جس قدر قرض چاہیں بینک سے حاصل کر کے ادائیگیوں کیلئے استعمال کرسکیں گے اور بینک ان کی یہ طلب پوری کرنے کا مکلف ہوگا (معاشیات کے posr keynasian فرقے خصوصاً kaldor وغیرہ کے پیروکار اسی نقطہ نظر کے حامی ہیں کہ بینک جتنی قوت خرید چاہے پیدا کرسکتا ہے، مرکزی بینک کا کام ایسی زری پالیسی بنانا ہوتا ہے جو زر کی کسی بھی مخصوص طلب کے جواب میں تخلیق کیئے گئے زر کو regulate سکے)۔ درحقیقت Electronic money کا استعمال جس رفتار سے بڑھے گا بینکوں کی لامحدود قرض دینے کی صلاحیت میں بھی اسی رفتار سے اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور یہی وجہ ہے کہ بینک ہمیشہ Electronic money کے استعمال اور اسکے فروغ کو ترویج دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

چوتھی سطح: اس تجزیئے کی چھوتھی سطح یہ ہوگی کہ ہم یہ فرض کریں کہ لوگ بینک ڈپازٹس کے علاوہ سرکاری نوٹ بھی بطور آلہ مبادلہ استعمال کرتے ہیں۔ اس صورت میں درج بالا فارمولا ذرا پیچیدہ ہو جائے گا جس کی تفصیلات بیان کرنا یہاں ایک تو نہایت مشکل امر ہے، نیز اس بحث سے درج بالا نتیجے (کہ بینک فرضی اور تخلیق کرتا ہے) میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی (سوائے اس سے کہ بینک کی اس صلاحیت میں ذرا کمی آجاتی ہے)۔ لہٰذا ہم اس بحث سے صرف نظر کرتے ہیں شوقین حضرات اس کی تفصیلات macro economics کی درسی کتب میں ملاحظہ کرسکتے ہیں (مثلاً دیکھئے Abel and Barnanke کی کتاب Macro economics)۔

اس بحث سے درج ذیل باتیں واضح ہوئیں:

۱۔ بینک قرض بچتوں سے نہیں دیتے یعنی بینک ہرگز ایک زری ثالث نہیں ہوتا۔

۲۔ بینک 'قرضے ڈپازٹس کا باعث بنتے ہیں' کے اصول پر کام کرتا ہے۔

۳۔ بینک کے قرض کبھی بھی بچتوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔

۴۔ بینک جو زر تخلیق کرتا ہے، وہ قرض کی صورت میں (یعنی debit money) ہوتا ہے۔

۵۔ نظام بینکاری مالیاتی وزری نظام کو قرض پر مبنی زر پر منتج کرتا ہے۔

۶۔ چونکہ مرکزی اور کمرشل بینک یہ قرض سود پر دیتے ہیں، لہذا بینک سود کو بذریعہ debit money پورے معاشروں پر غالب کر دیتے ہیں۔(انہی معنی میں آج ہر وہ شخص جو ریاستی نوٹ اور بینک کے چیک استعمال کرتا ہے درحقیقت سود کھا رہا ہے)۔

۷۔ بینکنگ فی الحقیقت جھوٹ، فریب اور چال بازی پر مبنی ہے۔

۸۔ بینک کی اصل آمدن کا ذریعہ بھی جھوٹ اور فریب پر مبنی وعدے ہوتے ہیں۔

۹۔ مرکزی بینک کے بغیر بینکاری کا یہ نظام محفوظ طریقے سے چلنا نہایت مشکل امر ہے۔

بینک سرکاری نوٹوں کے مقابلے میں کس قدر زیادہ زر جاری کرتے ہیں اسے سمجھنے کیلئے سٹیٹ بینک آف پاکستان کے جون ۲۰۰۸ کے یہ اعداد و شمار ہی کافی ہیں:

متعلقہ تفصیل	مالیت (ملین روپوں میں)
کل کرنسی نوٹ (M1)	982,325 (نو کھرب بیاسی ارب)
بینک ڈپازٹس ملا کر کل جاری کردہ زر (M2)	4,689, 143 (چھیالیس کھرب نواسی ارب)
کرنسی نوٹوں کے مقابلے میں بینک زر کا تناسب	4.77

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کمرشل بینکوں نے مرکزی بینک کے باہر ایک نوٹ کے بدلے تقریباً پونے پانچ روپے تک ڈپازٹس جاری کر دئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اکانومی میں کل زر کا صرف بیس فیصد نوٹوں کی شکل میں جبکہ بقیہ قرض پر مبنی جاری کردہ رسیدوں (ڈپازٹس) کی صورت میں موجودہ ہے (یہاں بینکوں کا اپنے کھاتے داروں سے یہ وعدہ بھی یاد رہے کہ وہ جب چاہیں اپنے ڈپازٹس کو نوٹوں میں تبدیل کروا سکتے ہیں)۔ پاکستان کے مقابلے میں دیگر ترقی یافتہ ممالک جہاں زری مارکیٹیں بھی بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں وہاں یہ تناسب اس سے بھی زیادہ ہے (مثلاً برطانیہ میں یہ تناسب نوے فیصد سے بھی زیادہ ہے)۔ ان اعداد و شمار سے دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ کل زر کا بڑا حصہ کمرشل بینک جاری کرتے ہیں نہ کہ مرکزی بینک (جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے)۔

حواشی:

۱۔اسلامی بینکاری پر نظاماتی حوالے سے تنقید کے لیے دیکھیے راقم الحروف کے مضامین:

☆'اسلامی معاشیات یا سرمایہ داری کا اسلامی جواز'، ماہنامہ الشریعہ اگست تا اکتوبر ۲۰۰۸

☆'سودی بینکاری فلسفہ اسلامی متبادل کا جائزہ'،مضمون مکمل مگر اشاعت کا منتظر ہے

اس ضمن میں پروفیسر محمد امین صاحب کا مضمون 'اسلامی بینکاری کی شرعی حیثیت: ایک اصولی بحث' بھی لائق مطالعہ ہے۔ دیکھئے ماہنامہ ''محدث'' شمارہ ستمبر/اکتوبر ۲۰۰۹ لاہور۔اس کے علاوہ ماہنامہ ''ساحل'' کراچی میں بھی اس موضوع پر قیمتی مواد موجود ہے۔

۲۔مجوزین کس طرح تمام سرمایہ دارنہ محرکات اور اداروں کی اسلام کاری کرتے ہیں، اس کی تفصیلات مولانا تقی عثمانی صاحب کی کتاب 'اسلام اور جدید معیشت وتجارت' میں دیکھی جاسکتی ہیں جس کا تجزیہ راقم نے اپنے مضمون 'اسلامی معاشیات یا سرمایہ داری کا اسلامی جواز' میں پیش کیا ہے۔

۳۔اسلامی بینکاری کے مجوزین علماء کی تحریروں سے مانوس قاری شدت کے ساتھ یہ تاثر لیتا ہے کہ جب خالصتاً دینی مسائل پر ان علماء کی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ علم کا کوئی بحر بیکراں ہے جو ایک طرف اسلاف کی کتب کا وسیع مطالعہ رکھتا ہے تو دوسری طرف علم وحکمت کے موتی بکھیرنے میں بھی ید طولی رکھتا ہے، مگر جونہی ان علماء کی ان کتب کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جو دور جدید کے معاشی یا فائنانشل نظاموں سے متعلق ہیں تو حقیقت کچھ یوں عیاں ہوتی ہے گویا یہ سب باتیں کسی سے سن کر یا دوسرے اور تیسرے درجے کے مصنفین کی کتابوں سے پڑھ کر اور حق سمجھ کر لکھ دی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علماء کرام روایتی مکتبہ فکر پر کی جانے والی تنقیدات ار جدید نظریات سے واقف نہیں ہوتے۔

۴۔درحقیقت نظریہ بینکنگ ہی نہیں بلکہ جس چیز کو 'اسلامی معاشیات' کے نام پر فروغ دینے کی کوشش کی جارہی ہے، وہ سب نیو کلاسیکل (یالبرل) اکنامکس ہی کا چربہ ہے۔ چونکہ اسلامی معاشیات کی حیثیت نیو کلاسیکل اکنامکس کے محض ایک فٹ نوٹ (footnote) کی ہی ہے لہذا یہ نیو کلاسیکل نظریہ زر و بینکاری کو مفروضے کے طور پر قبول کرنے پر مجبور ہے۔

۵۔زر اشیاء کی قیمتوں اور ان کی مقدار کا تعلق جس مساوات سے ظاہر کیا جاتا ہے، اسے Quantity Theory of Money کہتے ہیں۔ یہ مساوات درج ذیل ہے:

Mxv....PxY

یہاں M سے مراد زر کی رسد (money supply)، V سے Velocity of money، P سے قیمتوں کا اشاریہ (price level) اور Y سے مجموعی پیداوار (out put or GDP) ہے۔ نیو کلاسیکل مفکرین کے خیال میں Y (مقدار پیداوار) کا انحصار رسد سے متعلق عناصر پر ہوتا ہے لہذا زر کی رسد بڑھانے سے یہ غیر متبدل رہتا ہے۔ اسی طرح V کی مقدار بھی ایک عرصے تک غیر متبدل رہتی ہے لہذا اس مساوات سے ظاہر ہے کہ اگر V اور Y کی مقدار تبدیل نہ ہو اور M میں اضافہ کردیا جائے تو اس کا نتیجہ صرف P یعنی قیمتوں میں اضافہ ہوگا۔ مضمون کی مثال میں V کی مقدار 'ایک' فرض کی گئی ہے۔

۶۔T. Bill ایک قلیل المدت فائنانشل دعوی ہوتا ہے جو مرکزی بینک حکومت کیلئے قرض پر رقم کے حصول کیلئے جاری کرتا ہے۔

۷۔دونوں میں فرق یہ ہوتا کہ T.Bills کے ذریعے حاصل کردہ قرض پر سود کی شرح زیادہ ہوتی ہے جبکہ نوٹوں پر واجب الاداء

سود نہایت کم ہوتا ہے۔ یہی حکومتوں کو کم قرض لے کر زر کی رسد میں کم اضافہ کرنے پر مجبور کرے گی۔

۸۔ نیو کلاسیکل نظریات میں زر کی رسد کو درج ذیل مساوات کی صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے: یہاں M سے مراد زر کی رسد G سے حکومتی اخراجات، T سے ٹیکس وصولیاں اور Bg سے سرکاری بانڈز ہیں (t اور t-1 سے مراد موجودہ اور پچھلا سال ہے)۔ اس مساوات سے عین واضح ہے کہ زر کی رسد سے مراد وہ حکومتی اخراجات ہیں جو حکومت ٹیکس وصولیوں کے بغیر قرض پر مبنی زر سے پورا کرتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ مولانا تقی عثمانی صاحب اپنی کتاب 'اسلام اور جدید معیشت وتجارت' میں زر قانونی کی بات تو کرتے ہیں مگر اس چیز کا کوئی ذکر نہیں کرتے کہ یہ قرض ہوتا ہے۔

۹۔ نیو کلاسیکل مفکرین کا یہ خیال کہ سرمایہ دارانہ (یعنی قرض پر مبنی) زر کسی فطری ارتقاء کی پیداوار ہے ایک جھوٹا دعویٰ ہے، بلکہ یہ لعنت معاشروں پر بذریعہ ریاستی جبر اور نظام بینکاری مسلط کی جاتی ہے۔ نوعیت وارتقاء زر پر نیو کلاسیکل مفکرین کے خیالات کے لیے دیکھیے Menger کا مضمون On the Origins of Money۔

۱۰۔ نیو کلاسیکل اکنامکس کے جدید (مثلاً کنیزین) نظریات میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ زر میں اضافہ اشیاء کی مقدار میں اضافے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اس صورت میں اشیاء کی قیمتوں اور مقدار دونوں میں کتنا اضافہ ہوگا، اس کا انحصار (رسد کی لچک) پر ہے اگر رسد مکمل طور پر غیر لچک دار ہو (جیسا کہ روایتی نیو کلاسیکل مفکرین کا خیال ہے کہ وہ قلیل اور طویل دونوں مدتوں میں ہوتی ہے) تو زر کا نتیجہ صرف وصرف افراط زر ہوتا ہے

۱۱۔ دیکھئے Hayek کی کتاب prices and production(1935) یا Money and Banking کی کوئی سی کتاب جیسے The Economics of Money Banking and Financial by Frederic Mishkin

۱۲۔ Saving-investment equllibrium درحقیقت نیو کلاسیکل macroeconomics میں کسی معیشت کی حالت توازن بیان کرنے کی ایک اہم مساوات ہے، یعنی کوئی معیشت اس وقت حالت توازن میں ہوتی ہے جب وہاں بچتیں سرمایہ کاری کے برابر ہوں۔

نیو کلاسیکل مکتبہ ہائے فکر کی ایک بنیادی خامی موجودہ زر کو فرض کر کے سرمایہ دارانہ معیشتوں کا تجزیہ کرنا ہے۔ یہ مفروضہ علم معاشیات کے تقریباً ہر جدید نظریے میں رد کیا جا چکا ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ یا مروجہ زر ایک endogenous (داخلی) عنصر کی حیثیت رکھتا ہے جس کی مقدار کا تعین اشیا کی لین دین کیلئے کی جانے والی طلب سے ہوتا ہے دیکھئے Post.Keynasain Theores مثلاً

☆ Philip Arestis and Thanos Skouras کی کتاب Post Keynesian Economic Theor

Louis Philippe and Sergio Ross کی کتاب Modern Theories of Money

☆ Philip Arestis and Malcom Sawyer کی کتاب A Handbook of Alternative Monetary Economics

۱۴۔ مشہور معیشت دان Schumpeter نے یہ بات 1934 میں اپنی کتاب Theory of Economic Development ،Chap 3part 1 میں بیان کردی تھی۔

۱۵۔ نیوکلاسیکل نظریہ معاشیات میں بچتوں کو سرمایہ کاری سے قبل فرض کرنے کی کوئی علمی بنیاد موجود نہیں کیونکہ ان کے نظریہ تقسیم دولت (جسے marginal productivity theory کہتے ہیں) کے مطابق تمام ذرائع پیداوار کو ان کی اجرت وغیرہ پیداواری عمل مکمل ہونے کے بعد ادا کی جاتی ہے، لہذا ان کے ماڈل میں پیداواری عمل شروع کرنے سے قبل کسی سرمایہ کاری کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے برعکس کلاسیکل مفکرین (جیسے ریکارڈو اور مارکس) وغیرہ کے خیال میں اجرتیں پیداواری عمل مکمل ہونے سے قبل ادا کی جاتی ہیں لہٰذا ایک ابتدائی سرمایہ کاری فرض کرنا لازم ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف کلاسیکل مفکرین تقسیم دولت کی marginal productivity theory کو تسلیم نہیں کرتے (جو نیوکلاسیکل مکتبہ فکر میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے) اور دوسری طرف Chap 3 ، Development میں بیان کردی تھی۔

۱۵۔ نیوکلاسیکل نظریہ معاشیات میں بچتوں کو سرمایہ کاری سے قبل فرض کرنے کی کوئی علمی بنیاد موجود نہیں کیونکہ ان کے نظریہ تقسیم دولت (جسے marginal productivity theory کہتے ہیں) کے مطابق تمام ذرائع پیداوار کو ان کی اجرت وغیرہ پیداواری عمل مکمل ہونے کے بعد ادا کی جاتی ہے، لہذا ان کے ماڈل میں پیداواری عمل شروع کرنے سے قبل کسی سرمایہ کاری کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے برعکس کلاسیکل مفکرین (جیسے ریکارڈو اور مارکس) وغیرہ کے خیال میں اجرتیں پیداواری عمل مکمل ہونے سے قبل ادا کی جاتی ہیں لہٰذا ایک ابتدائی سرمایہ کاری فرض کرنا لازم ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف کلاسیکل مفکرین تقسیم دولت کی marginal productivity theory کو تسلیم نہیں کرتے (جو نیوکلاسیکل مکتبہ فکر میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے) اور دوسری طرف ان کے خیال میں بچت اور سرمایہ کاری معیشت کے دو علیحدہ ایجنٹ (بالترتیب عام صارفین اور کاروباری طبقہ) نہیں کرتے جیسا کہ نیوکلاسیکل مفکرین کا خیال ہے بلکہ یہ دونوں کام ایک ہی ایجنٹ یعنی سرمایہ کار کرتے ہیں۔

۱۶۔ تمسکات (securities) بھی فائنانشل دعوے ہوتے ہیں جنہیں عام طور پر کاروباری و مالیاتی ادارے جاری کرتے ہیں اور ان کا مقصد قرض پر رقم کا حصول ہوتا ہے۔

۱۷۔ ظاہر ہے اس عمل کے نتیجے میں تقسیم دولت کے نظام پر انتہائی مضر اثرات مرتب ہوئے کیونکہ اب قرض کی صورت میں دولت کا جھکاؤ ان لوگوں کی طرف ہوگیا جو پہلے سے اتنے ہوں کہ قرض کی مطلوبہ رقم سے زیادہ رہن جمع کرواسکتے ہوں۔ بینکنگ کی اسی حکمت عملی پر یہ طنز کسا گیا ہے کہ 'بینک آپ کو قرض تب دے گا جب پہلے آپ یہ ثابت کردیں کہ آپ کو اس قرض کی ضرورت نہیں'۔ موجودہ دور میں دولت کی ہوش باغیر منصفانہ تقسیم درحقیقت نتیجہ ہے اس ظلم کا جو صدیوں تک نظام بینکاری کے نام پر قانوناً لوگوں پر روا رکھا گیا۔

افسوس کہ مجوزین کو اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے بجائے اسی بینکاری کا حصہ بن جانے کی فکر لاحق ہے۔

۱۸۔ یہ تمام تفصیلات نفس موضوع سے متعلق نہیں، اس کیلئے دیکھئے Tawney کی کتاب Religion and the Rise of Capitatism (خصوصی طور پر باب نمبر دو The Continental Reformers)

۱۹۔ دیکھئے Malcolm Sawyer کی کتاب The Political Economy of Central Banking

۲۰۔ Barter economy ، monetary economy اور crdit economy کا فرق سمجھنے کیلئے دیکھئے Augusto Grazi

۲۱۔ جو لوگ نظام بینکاری کی حقیقت اور وہ معاشی ماحول جس میں یہ کام کرتا ہے اسے درست طریقے سے سمجھنے سے قاصر رہے وہ اسلامی تاریخ میں بینک تلاش کرنے کی غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ مجوزین میں سے بعض کا یہ دعوی ہے کہ بینکاری کی ابتدا امام ابو حنیفہؒ سے ہوئی جن کے پاس لوگ اپنی امانتیں رکھواتے اور وہ انہیں کاروبار کیلئے آگے قرض وغیرہ پر دے دیا کرتے۔ فرض کریں مجوزین کا یہ دعوی تاریخی طور پر درست ہے کہ امام صاحب ایسا کرتے تھے مگر سوال تو یہ ہے کہ اس سارے عمل سے بینک کی صورت کہاں پیدا ہوئی؟ بینکنگ کی صورت حال تب پیدا ہوتی ہے جب قرض نجی معاملے سے آگے بڑھ کر آلہ مبادلہ حیثیت اختیار کر لیتا۔ امام صاحب (۱) پھر انہی مقروض لوگوں سے دوبارہ امانتیں (deposits) وصول کر کے اپنے فنڈ میں جمع کر لیا کرتے تھے جنہیں وہ قرض دیا کرتے تھے؟ اور (۲) اپنے قرض خواہوں اور مقروضوں کو اصل زر کے بجائے کی رسیدیں بطور آلہ مبادلہ استعمال کیلئے جاری کیا کرتے تھے؟ اگر کوئی یہ کہے کہ امام صاحبؒ ایسا کرتے تھے تو وہ ان کے ذات پر بہت بڑا بہتان باندھے گا۔ درحقیقت امام صاحبؒ کے طرز عمل کو وہی شخص بینکنگ کہہ سکتا ہے جو نیو کلاسیکل نظریہ بینکاری کو درست سمجھنے کی غلط فہمی کا شکار ہو۔

۲۲۔ غریب طبقے پر زیادہ اثرات اس لیے پڑتے ہیں کہ اسے اضافی (relative) اعتبار سے قوت خرید میں زیادہ کمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۲۳۔ یعنی ایک مزدور دن رات محنت کر کے اپنی روزی کمائے، کارخانے دار اپنے سرمائے کو کاروبار میں لگا کر آمدن کمائے مگر بینک محض زر تخلیق کر کے مزے کرتا پھرے؟

۲۴۔ Reserve سے مراد ک ڈپازٹس کا وہ حصہ ہے جسے بینک کرنسی کی شکل میں اپنے اور مرکزی بینک کے پاس جمع رکھتے ہیں۔ سو فیصد reserve banking کا مطلب ایسی بینکاری ہے جہاں بینک کل ڈپازٹس کے برابر (یعنی ڈپازٹس کا سو فیصد reserve) کی شکل میں اپنے پاس محفوظ رکھیں اور کسی قسم کا قرضہ جاری نہ کریں۔

۲۵۔ یہ بات درست ہے کہ موجودہ حالات میں علماء خود کو اس امر پر مجبور پاتے ہیں کہ وہ لوگوں کو قابل عمل فتوے دیں کیونکہ لوگ ان سے اسی مقصد کیلئے سوال کرتے اور اپنے مسائل کے حل کیلئے رجوع کرتے ہیں۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام کا مسلط کردہ یہ 'دائرہ جبر' تب ہی تو کم ہوگا جب علماء اس نظام سے باہر 'دائرہ اختیار' قائم کرنے اور اسے بڑھانے کی کوئی جدوجہد کریں گے۔ ہمیشہ ایسے فتوے دینے کی حکمت عملی پر کاربند رہنا۔ جس کا مقصد لوگوں کے لیے خود کو موجود نظام کے اندر سمونا ممکن بنانا ہو (how to fit in the given environment) درحقیقت دائرہ جبر کو مزید بڑھانے کی حکمت عملی ہے۔ اسلامی بینکاری نہ صرف اس دائرہ جبر کو بڑھا رہی ہے بلکہ اس کے جبر ہونے کا احساس بھی دلوں سے نکال رہی ہے۔

۲۶۔ سرمایہ دارانہ نظام کیا ہے اور اس کا مکمل انہدام کیوں ضروری ہے، اس کے لیے دیکھئے

☆ ڈاکٹر جاوید اکبر انصار Rejecting Freedom and Progress، جریدہ ۲۹، کراچی یونیورسٹی

☆ ڈاکٹر جاوید اکبر انصار، 'عالم اسلام اور مغرب کی کشمکش'، کتاب 'سرمایہ دارانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ' (ص ۱۹۲-۲۴۵)

سرمایہ دارانہ معاشی وریاستی صف بندی کی حقیقت جاننے کے لیے دیکھئے:

☆ ڈاکٹر جاوید اکبر انصار، سرمایہ دارانہ معیشت، کتاب سرمایہ دارانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ (ص:۱۱۰-۱۲۱)

☆ ڈاکٹر جاوید اکبر انصار، لبرل سرمایہ دارانہ ریاست، کتاب سرمایہ دارانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ (ص:۱۶۰-۱۸۲)

سرمایہ داری کے خلاف اسلامی انقلابی جدوجہد کے خدوخال کیا ہوسکتے ہیں اس کے لئے دیکھئے:

☆ ڈاکٹر جاوید اکبر انصار، جماعت اسلامی کی انقلابی جدوجہد برائے ۲۰۰۸-۲۰۱۳، کتاب جمہوریت یا اسلام (ص:۲۲۳-۲۷۸)

بینکاری کا متبادل کیا ہوسکتا ہے، نیز زر اصلی کی طرف کیسے لوٹا جاسکتا ہے، اس کے لیے دیکھئے:

☆ یونس قادری، کھاتے دار تمویلی ادارے: ایک متبادل، جریدہ ۳۷، کراچی یونیورسٹی پریس

☆ یونس قادری، Pakistan Business Review Vol , can we creat our own 11 (1) Currency?

☆ History of Banking : An Analysis, Tarek Al Dawani

دعائے مغفرت کی اپیل

ازھر ھند دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب اس دنیائے فانی سے رحلت فرماگئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون جملہ قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔